بات میں گھات

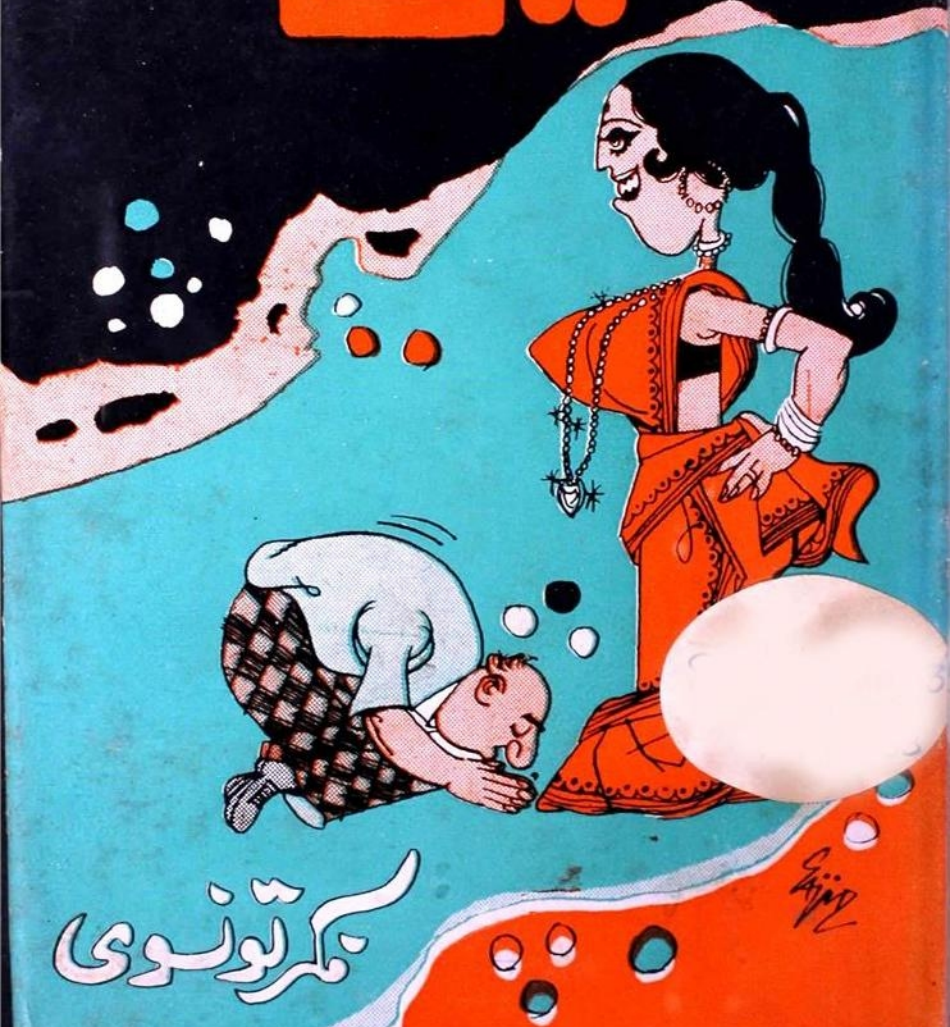

فکر تونسوی

بات میں گھات

طنزیہ مضامین

BAAT MEN GHAT

BY

FIKER TONSVI

PRICE Rs. 20/-

فکر تونسوی

اور برابر بانٹ کو ہی ہمارے ملک میں سوشلزم کہا جاتا ہے۔"

ہاں، ہندوستانی باشندے چوری کو گناہ سمجھتے ہیں، مگر گناہ کا نام بدل کر تسکین قلب حاصل کر لیتے ہیں، کبھی کبھی عبادت خانے کو دان دے کر کبھی دھوا آشرم کو چندہ دے کر اور کبھی اسے سوشلزم کا سرخ رنگ دے کر۔ یعنی ہندوستان میں ہر آدمی چور ہے مگر ایک آدمی چور نہیں۔ فقط چند ہی بدنصیب ایسے ہوتے ہیں۔ جو اسکول کی کتاب میں ایک مرتبہ پڑھ لیتے ہیں کہ چوری کرنا گناہ ہے تو مرتے دم تک اس گناہ سے یوں الگ تھلگ رہتے ہیں۔ جیسے کوئی کافر انسان عمر بھر خدا سے منکر رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اصول پرست کہا جاتا ہے۔ لوگ اُس کی اصول پرستی اور بے وقوفی دونوں پر تحسین کے پھول برساتے ہیں اور خدا کا شکر کرتے کہ اصول پرستی کی وجہ سے ہندوستان میں کم از کم بے وقوفی تو زندہ ہے ـــــ مثلاً ایک مرتبہ ایک تانگہ بان نے اخبار میں اشتہار چھپوایا۔

"کل میرے تانگہ میں کوئی صاحب نیلے رنگ کا ایک اٹیچی بھول گئے اٹیچی میں ہزاروں روپے ہیں۔ جو صاحب واضح ثبوت دے سکیں کہ کتنے ہزار روپے ہیں وہ فلاں ایڈریس پر آکر مجھ سے اٹیچی واپس لے جا سکتے ہیں۔"

چنانچہ شہر بھر میں اُس تانگہ بان کی تعریف کے پل باندھے گئے، جوق در جوق لوگ اُس مقدس تانگہ بان کے درشن کرنے کے لیے گئے۔ بلکہ ایک وزیر نے تو یہ بیان دے دیا کہ ایسے مجسم صدق و صفا انسان کو پدم شری کا خطاب دیا جائے۔ (حالانکہ اس وزیر نے اپنی سرکار سے بھی چور سے چھپے افیون کے پانچ کھیت اگا رکھے تھے۔)

فیصلہ کر لیا ہے۔ بولا "کیوں صاحب! میرے اخبار میں آپ کو کوئی نقص نظر آیا کہ غریب کی روزی پر لات مار رہے ہیں۔ پچاس پیسے روزانہ بچا کر کیا آپ محل ماڑی کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ بے وقوف غریبی امیری کی فلاسفی لے بیٹھا۔ حالانکہ کئی لوگ غریبوں کے لیے آنسو بہا بہا کر کافی امیر ہو چکے تھے۔ اتنے زیادہ امیر کہ اُن کے پاس بہانے کے لیے اب آنسو ہی نہیں رہے تھے۔ غریبوں کے کئی لیڈر تو آنسو بھی امپورٹڈ منگا رہے تھے۔

میں نے ہاکر سے کہا۔ "شبّن لال! مسئلہ پچاس پیسے کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ تم ہر روز پرانا اخبار سپلائی کر دیتے ہو۔"

"نہیں صاحب! ہر روز اخبار نیا ہوتا ہے مثلاً آج اس پر تاریخ پڑھ لیجیے۔"

"تاریخ کی ماں کی.....؟" میں نے بازاری گالی دی۔ "یہ پرانا اخبار ہے۔ مثلاً یہ خبر دیکھو۔ ایک پچیس سالہ مہلا کو جہیز کے سوال پر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔"

وہ بولا "جناب یہ خبر جھوٹی نہیں ہے۔"

"ارے جھوٹی کو چھوڑو۔ پرانی ہے۔ کل کے اخبار میں بھی یہی خبر تھی پرسوں کے اخبار میں بھی، اترسوں کے بھی....." اور یہ کہہ کر میں نے گزشتہ پانچ چھ روز کے اخبار نکال کر ہاکر کے منہ پر پھینک دیئے۔ "پڑھو انہیں۔ ہر روز وہی خبر۔ کیا میں ہر روز تمہیں پرانی خبر پڑھنے کے عوض پچاس پیسے دیا کروں؟"

ہاکر کچھ بوکھلا گیا۔ حالانکہ وہ اپنے ڈیفینس میں کہہ سکتا تھا کہ اس اخبار میں ایک نئی خبر بھی ہے کہ گورنمنٹ جہیز کے متعلق کچھ سخت اقدامات کر رہی ہے۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ شاید میں یہ نہ کہہ دوں کہ یہ خبر تو مٹی کے تیل سے کی مہنگائی سے بھی زیادہ

پرانی ہے اس بات پر تو دو چار فیصد اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ تیل ڈپو پر شاید کبھی تیل مل بھی جائے۔ مگر گورنمنٹ ہر روز ایسے اعلانات کر کر کے اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔

اور ادھر میں نے اپنا جملہ جاری رکھا۔ اور یہ دیکھو، بنک میں ڈاکہ پڑا۔ پولیس ملزم کو گرفتار نہیں کر سکی۔ اور یہ خبر آج چھپی ہے، پرسوں کے اخبار میں بھی تھی۔

ہاکر بولا۔ "اجی پرسوں والے بنک کا نام اور تھا۔ آج والا بنک اور ہے۔"

"ابے بنک کا نام بدلتا ہے۔ خبر کی روح تو نہیں بدلتی۔ اور پرانی گھسی پٹی روح کے تم پچاس پیسے مانگتے ہو۔ کیا بیوقوف سمجھ رکھا ہے مجھے؟"

وہ بولا۔ "مگر صاحب! یہ ایران کے خمینی صاحب کی خبر تو نئی ہے۔ کہ اس نے ستر افراد گولی سے اڑا دیئے۔"

میں نے کہا۔ "اور کل پینتیس آدمی اڑائے تھے۔ خمینی اڑاتا چلا جائے اور میں پچاس پیسے دیتا چلا جاؤں۔ آدمی ہوں۔ اخبار پڑھنا آج سے بند۔ میں باسی خبریں پڑھ کر اپنے اندر مزید بدبو نہیں پیدا کرنا چاہتا۔"

ہاکر نے مجھے لاکھ قائل کرنا چاہا۔ کہ آج خمینی صاحب نے جو آدمی ہلاک کرا دیئے ہیں وہ شاعر اور ادیب تھے لہٰذا یہ نئی اور دلگداز خبر ہے مگر میں نے اخبار پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ لہٰذا اندر رشوت ستانی، وام کے ہم گنگ، خود شادی توڑ لے، بھاشن، جیب کتری، مہنگائی، کمیشن کی جو سب خبریں پڑھ پڑھ کر میں بور ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں نے سامنے خربوزے کی ریڑھی والے سے ایک خربوزہ خریدا اور پچاس پیسے اُسے دے دیئے۔

یہ اور بات ہے کہ خربوزہ پھیکا نکلا کل کی طرح پھیکا، پرانا، باسی خبر لکھے والا خربوزہ۔ اور مجھے یوں لگا جیسے وہ بھی مجھے خربوزے کی بجائے اخبار دے گیا۔

کوئی پتھر سے نہ مارے...

وہ میرے ڈرائینگ روم میں پڑی ہوئی بید کی کرسی پر اس دھماکے سے بیٹھا کہ میں نے سوچا۔ اب کرسی ضرور ٹوٹ جائے گی۔ آدھی کرسی چند دن پہلے ٹوٹ چکی تھی۔ کیونکہ اس پر ایک دبنگ لیڈر آ کر بیٹھا تھا۔ باقی آدھی کرسی ٹوٹنے کی باری آج تھی۔

میں نے کہا۔ "فرمائیے؟"

وہ بولا۔ "میرے پاس ایک پتھر ہے۔"

"تو کیا آپ کو کوئی مجنوں چاہیئے، جسے آپ پتھر مار سکیں۔"

"نہیں مجھے مجنوں نہیں۔ گاہک چاہیئے۔"

میں سمجھا۔ یہ کوئی دکاندار ہے۔ گاہک کی جیب کاٹنے والے کو آج کل کوئی دکاندار کہتا ہے اور کوئی جیب کترا۔ مگر وضع قطع سے نہ وہ کوئی دکاندار لگتا تھا۔ نہ

جیب کترا۔ اس کا آدھا لباس شریفانہ لگتا تھا اور آدھا غیر شریفانہ تھا۔ آدھا لیڈر پن اور آدھا دیسی ـــ نکٹائی کے ساتھ ماتھے پر لمبا سا تلک ـــ ویسے آج کل سوداگر حضرات ایسا ہی ملا جلا لباس پہنتے ہیں۔ اور ان کے سر پر گاندھی ٹوپی بھی ہو تو سمہ آتشہ لگتے ہیں۔

میں نے دیکھا وہ سفید اور سرخ کھچڑی رنگ کا ایک چھوٹا سا گول پتھر تھا پتھر اگر کافی بڑے سائز کا ہوتا تو اسے عمارت کی تعمیر میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ آج کل خالص دودھ کی طرح خالص اینٹیں بھی نایاب ہو چکی ہیں۔ مگر یہ چھوٹا سا پتھر تو زیادہ سے زیادہ غلیل میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اور لوگ آج کل پتھر کے زمانے سے نکل کر جمہوری زمانے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور جمہوریت کی بقا کے لیے چاقو اور پستول استعمال کرتے ہیں غلیل نہیں۔

اوں۔ ہوں پاس شخص کو گاہک نہیں مل سکتا یہ تو سودائی ہے۔

گاہک؟ کس قسم کا گاہک؟ میں نے وضاحت چاہی ـــ

وہ کہنے لگا۔ "اس ہندوستان کا ہر آدمی اس پتھر کا گاہک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آج ہر ہندوستانی باشندہ کسی نہ کسی دکھ اور پریشانی کا شکار ہے ـــ یہ پتھر ان کی ہر پریشانی دور کر دے گا۔ مثلاً۔ آپ اس کے گاہک ہو سکتے ہیں۔ اسے ذرا اپنی جیب میں رکھ کر دیکھئے۔"

"مجھے چند دنوں سے سیمنٹ کی ایک بوری نہ ملنے کی پریشانی تھی۔ میں نے سوچا۔ ممکن ہے یہ پتھر الہ دین کا کوئی چراغ ہو۔ اور میں اسے جیب میں رکھوں گا، تو ادھر سول سپلائی انسپکٹر اپنے کندھے پر سیمنٹ کی بوری اٹھائے نمودار ہو جائے گا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے پتھر لے کر جیب میں رکھ لیا اور سول سپلائی انسپکٹر کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا ۔۔۔ ایک منٹ، دو، تین ۔۔۔ چوتھے منٹ کے بعد آواز آئی ۔۔۔ جناب! دوسری جیب سے پچیس روپے نکال کر مجھے عنایت کیجئے ۔۔۔"

میں سمجھا ۔ یہ آواز سول سپلائی انسپکٹر کی ہے جو سیمنٹ کی بوری کے پیسے طلب کر رہا ہے ۔

میں آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو ۔ اس نو وارد کا ہاتھ میرے آگے پھیلا ہوا تھا ۔

میں نے کہا ۔ "پچیس روپے کا ہے کے ؟"

"یہ اس پتھر کی قیمت ہے ۔"

گلوری سا ایک پتھر ؟ قیمت پچیس روپے ۔ مہنگائی کی حد ہے ۔ میرے منہ سے نکلا ۔ "دیکھئے جناب! آپ نے فرمایا تھا یہ ایک طلسمی پتھر ہے جسے جیب میں رکھتے ہی آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی ۔ اور اس وقت میری پریشانی سیمنٹ کی ایک بوری ہے ۔ سیمنٹ کی بوری تو آپ لیتے دیجئے ۔ اس پتھر کی قیمت بھی ادا کر دوں گا ۔"

وہ مسکرایا ۔ اس کی مسکراہٹ مجھے دلیل کرنے کے لیے کافی تھی ۔ اور بولا ۔ "دیکھئے آپ دراصل سمجھے نہیں ۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا ۔۔۔ دراصل آپ نے سمجھایا بھی نہیں ۔ آپ نے تو حکم دیا کہ اسے جیب میں رکھو پریشانی دور ہو جائے گی ۔ میں نے جیب میں رکھ لیا ۔ سیمنٹ کی بوری آئی نہیں ۔ پچیس روپے کس سلسلے میں دوں ۔"

"سنیئے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ یہ پتھر آپ جیب میں رکھے رہیئے۔ رکھے رہیئے۔ پھر یوں ہوگا کہ اس پتھر میں سے شعاعیں نکلنا شروع ہوں گی۔ جو آپ کی ہر پریشانی سے جاکر ٹکرائیں گی۔ اور پریشانی دور ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا وہ شعاعیں سول سپلائی افسر سے بھی جاکر ٹکرائیں گی؟"

"نہ صرف سول سپلائی انسپکٹر بلکہ ہاؤس ٹیکس انسپکٹر۔ انکم ٹیکس انسپکٹر۔ غرض انسپکٹر راج کے ہر انسپکٹر سے ٹکرا کر اسے بے چین کر دیں گی۔ اور وہ بھاگا بھاگا آپ کے قدموں میں آکر گرے گا۔"

وہ مسلسل تین منٹ تک بولتا رہا۔ اس کی گفتگو نے جو تصویر کھینچی وہ کسی حسین و جمیل خواب کی طرح دلآویز تھی۔ وہ خواب جو ہم گزشتہ تیس برس سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر ہر برس انسپکٹروں کی قطار بڑھتی جا رہی تھی۔ انسپکٹر اس خواب کی تعبیر تھے۔ جنہوں نے ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا دوبھر کر دیا تھا۔ سارا کوئی انسپکٹر آج تک قدموں میں آکر گرا نہیں تھا۔ بلکہ ہم ہی ان کے قدموں پر جاکر گرا چاہتے تھے۔ لیکن جب بھی جاتے معلوم ہوتا۔ انسپکٹر فیلڈ ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔

جب وہ خوابناک گفتگو کے بعد قدرے سانس لینے کے لیئے رکا تو میں نے کہا۔ "مگر جناب اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ انسپکٹر قدموں پر آگرے گا؟"

ہماری سوسائٹی میں جب کرپشن بہت زیادہ بڑھنے لگی ایک دوسرے پر اعتماد کی دیوار اڑا دھم کرنے لگی تو بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں نے گاہک کو خوش کرنے کے لئے گارنٹیاں دینا شروع کیں۔

ریفریجیریٹر ــــ گارنٹی دو سال

ٹی وی سیٹ ــــ گارنٹی پانچ سال

گھڑی ــــ گارنٹی دس سال

یہ الگ بات ہے کہ ہر شے کی گارنٹی کے بعد یا فرم فیل ہو جاتی ہے یا فرم کا مالک کہہ سکتا ہے۔ آپ کی شکایت نوٹ کر لی گئی ہے۔ ہمارا ایجنٹ شام تک پہنچ جائے گا۔ اور وہ اس شام تک کبھی نہیں آتا تھا جسے شامِ حیات کہتے ہیں۔

وہ کہنے لگا ــــ "گارنٹی؟ جناب! اگر آپ کی پریشانیاں دور ہونا شروع نہ ہو جائیں تو پچیس روپے واپس۔

میں نے کہا "مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ پچیس روپے واپس کر دیں گے کیا اس سے یہ بہتر نہیں رہے گا کہ وہ پچیس روپے فی الحال میرے پاس رہنے دیں۔ جونہی سمینٹ کی بوری مجھے مل گئی۔ میں آپ کو پچیس روپے منی آرڈر سے بھیج دوں گا۔"

وہ بولا۔ "مگر یہ اصول ہماری کمپنی کا نہیں ہے۔"

میں سمجھا یہ شاید اسی ٹھہر باز کمپنی کا سیلز ایجنٹ ہے۔ میں سیلز ایجنٹ کا ایک واقعہ پچھلے دنوں پڑھ چکا تھا کہ ایک سیلز ایجنٹ وقتِ مقررہ سے ایک ہفتہ پہلے اپنے گھر لوٹ آیا ہے کیا دیکھا کہ اس کی بیوی ایک اجنبی کی آغوش میں ہے۔ وہ غصے میں آکر کمپنی کے مالک کے پاس چلا گیا ــــ اپنی بیوی کا حشر سنا کر بولا ــــ "میں سیلز ایجنٹ

کی نوکری سے استعفیٰ دیتا ہوں۔

مالک نے کہا۔ "مگر اس میں تمہاری بیوی کا کیا قصور ہے۔ تم نے اُسے اپنا دورہ کینسل کر کے آنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی ہو گی ـــــ لہٰذا مجھے سیلز ایجنٹوں پر اعتماد نہیں رہا تھا جو اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھ سکتے ہیں۔ وہ مجھے کیوں دھوکہ نہیں دیں گے۔ چنانچہ میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پتھر جیب سے نکال کر اس سیلز ایجنٹ کو تاک کر نشانے پر مارا۔ اور وہ آدمی بالکل دیوانوں کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے یہ مصرع گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔ قہ قہ قہ۔ کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو۔"

بات میں گھات

بات میں گھات پیدا کرنا ہو تو اپنے آپ میں دو غلا پن پیدا کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ دو غلا پن بھی خدا کی عنایت ہے لیکن جو آدمی خدا کو صفر سمجھتے ہیں ان میں بھی دو غلا پن موجود ہے۔ بلکہ اگر دو غلے پن کا کمپی ٹیشن کیا جائے تو وہ سب سے ٹاپ پر رہیں گے۔ کئی سٹوڈینٹس سالانہ امتحان میں ٹاپ پر آجاتے ہیں حالانکہ وہ کورس کی کتابوں کو سال بھر بھی ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ تو کسی پراسرار طاقت کا کرشمہ ہوتا ہے۔

پراسرار طاقتوں کے ماتھے پر چندن کا بڑا سا ٹیکہ ہوتا ہے، یہ ٹیکہ دراصل ایک شیلی فون ہوتا ہے جو پولیس ہیڈ کوارٹر میں پہنچتا ہے تو ایک لیٹرا مجرم رہا ہو جاتا ہے کیونکہ سیاسی پارٹی کا ایک گرو ہوتا ہے جو سوشلزم لانے کے گئے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ نیم مردہ جانور کا لہو چوسنے والے بھی اگر

سوشلزم لانے کا عہد کرتے ہیں تو ایک معجزہ ہے اور معجزے کے بغیر ہندوستان میں سوشلزم نہیں آسکتا۔

گل مہر کے درخت پر بیٹھے ہوئے کوّے کو سوشلزم شعور نہیں ہے اور درخت پر بیٹھا لاکھ کائیں کائیں کرتا رہے مگر اس کی کائیں کائیں سے آسام کے الیکشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ درخت کے نیچے روتے ہوئے چار سال کے بچے پر اثر پڑ سکتا ہے بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ مگر کوّے کی اس سے کوئی سانجھ نہیں ہے، سانجھ صرف اس کی ماں کے لیئے ہے جو اس لیئے بجری کوٹنے میں مصروف ہے تاکہ محنت شاقہ کے پسینوں سے اس کے تھنوں میں دودھ اُتر آئے گا تو بچے کے آنسو خشک ہوں گے ــــ بجری اور آنسو ایک دوسرے سے بہت دور ہیں مگر پھر بھی کسی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

جڑے ہوئے تو ایک مرد اور ایک عورت بھی ہیں مگر پاکستان کے قانون شریعت کی روح نے انسانی چہرے کی ناک، کو کان کی جگہ لگا دیا ہے اور کان بے چارہ آنکھ کے مقام پر متعین کر دیا گیا ہے۔ جب کان کو دیدۂ بینا عنایت کیا جائے گا تو وہ یہی کہے گا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ ایک پڑھی لکھی خاتون سے کراچی میں پوچھا گیا۔ "آپ تعلیم یافتہ ہو کر بھی پاکستان کو چھوڑ کر یورپ کی طرف کیوں کوچ کر رہی ہیں" وہ بولی "کیونکہ مجھے یہاں کان سے دیکھنا پڑتا ہے جس سے مجھے یوں لگتا ہے، میں اندھی ہو گئی ہوں۔"

تانگہ بان کو صرف تعریف ملی اور کچھ نہ ملا اور وہ اپنی لوٹا مے کے بعد بدستور شام کو دال روٹی کھاتے اور بھگوان کے بھجن گاتے دیکھا گیا۔ حالانکہ ایک سیاسی پارٹی کے پریذیڈیٹ نے پارٹی میں تجویز پیش کی کہ اس ایماندار آدمی کو آئندہ الیکشن میں پارٹی ٹکٹ دیا جائے۔ مگر پارٹی کی ایگزیکٹیو نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی کہ ایمانداری ہماری پارٹی کے لیے ضرر رساں ہوگی۔ پارٹی میں کئی چوری چوری کے کام ہوتے ہیں۔ جنہیں یہ ایماندار تانگہ بان ایکسپوز کر دے گا جس سے پارٹی کا سیاسی امیج تہہ و بالا ہو جائے گا۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا۔ خود حاکم بھی چوری کو گناہ سمجھتے ہیں اور کسی نہ کسی نادر موقع پر کسی چور کو سزا بھی دے دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا۔ پھلوں کی مرصع دکان کے سامنے دو تین درجن آدمی آٹھ سال کے ایک لڑکے کو مکے اور لاتیں مار رہے تھے۔ میں نے پوچھا "اس غریب چھوکرے کی پٹائی کیوں ہو رہی ہے؟"

ایک تلک دھاری مہاشہ بولے "اجی یہ سور کا بچہ چور ہے۔ اس نے میری پھلوں کی دکان سے ایک کیلا چرا کر کھا لیا۔ اور آپ جانتے ہیں، شاستروں میں چوری گناہِ عظیم ہے۔"

لڑکا درمیان میں بطورِ احتجاج چیخ پڑا۔ "میں نے کیلا چوری نہیں کیا۔"

میں نے پوچھا "مگر تم نے دکان سے کیلا کیوں اٹھایا؟"

"ہاں، مگر مجھے سخت بھوک لگی تھی۔ بھوک کو یہ سب لوگ چوری کیوں کہہ رہے ہیں۔"

حیرت ہوتی ہے، شرم بھی آتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم انسان کو اندھا کیوں کر رہی ہے اگر کسی ملک کے باشندے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں تو اس ملک کے پورے ....
سماج کو اندھا ہو جانا پڑے گا۔

مگر میں پھر سوچتا ہوں، چلو کان کو تو چھوڑ دیا۔ وہ بے چارہ شرعی قانون کا بندھا ہوا مزدور ہے۔ اس کا اپنا کچھ نہیں، کان بھی نہیں جو سنتا تھا۔ مگر اس کی سُنی ہوئی بات کوئی نہیں مانتا، اسے آنکھوں کی جگہ فٹ کر دیا گیا۔ کہ اس سے دیکھنا شروع کرو مگر وہ دیکھ نہیں سکتا۔ البتہ جھوٹ موٹ کہہ سکتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں، ایک خونخوار، وحشی لالچی ٹھیکیدار اپنے مزدوروں کو بادام کا جوس اور کشمش کھلا رہا ہے۔

کل ایک دانشور دوست مجھے کہنے لگے "کان نے جو دیکھا، غلط نہیں دیکھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کان کے اس بیان پر آپ کو کیوں اعتراض ہے؟"
میں نے کہا "کیونکہ کان کا کام صرف سننا ہے، دیکھنا نہیں، دیکھنا تو صرف آنکھ کا رول ہے۔"

وہ بولا۔ "آپ کے خیال میں ہمارے ملک میں کتنی آنکھیں ہیں؟"
میں نے کہا "اندازاً ایک سو بیس کروڑ آنکھیں۔"

وہ کہنے لگا "مگر یہ سبھی آنکھیں چہرے پر موجود تو ہیں مگر دیکھ نہیں سکتیں۔ دیکھئے ایک جج کی آنکھ دیکھتی ہے کہ اس کا ریڈر ایک آسامی

سے پچیس روپے رشوت لے رہا ہے۔ لیکن جج سے پوچھو تو وہ کہے گا میری آنکھ نے تو کچھ نہیں دیکھا ـــــ ہاں، جج اندھا ہے اپنے دیکھنے کی طاقت اس نے اس ترازو کے پلڑے سے لٹکا دی ہے جو اس کی پشت پر بسلسلہ انصاف لٹکا ہوا ہے۔

میں نے اس دانشور سے کہا "آپ جھوٹ بولتے ہیں۔"

مگر وہ بولا۔ "مگر یہ ایسا جھوٹ نہیں ہے جو سیاسی لیڈر اس لیۓ بولتے ہیں تاکہ دوسرے دن اخبار میں اس تردید کی شمع روشن کر دیں اور عوام کو دکھلا سکیں کہ میرے ماتھے پر چندن کا تلک لگا ہوا ہے۔

ممکن ہے چندن اندھا ہو، آنکھوں کے باوجود اندھا ہو اور پھر ہر شئے میں ملاوٹ ہو رہی ہے تو چندن بھی ملاوٹی ہوگا، آنکھیں ہیں دیدۂ بینا نہیں ہے تو ممکن ہے ملاوٹی ہوں۔ سرکار نے مٹی کا تیل مہنگا کر دیا۔ حالانکہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ آنکھیں رکھتی ہے، نہ جانے وہ یہ دعویٰ کب کرے گی کہ وہ آنکھیں رکھنے کے باوجود یہ نہیں دیکھتی کہ مٹی کا تیل صرف غریب لوگ استعمال کرتے ہیں، غریب لوگ ہی سرکار بناتے ہیں مگر یہ دیکھ نہیں پاتے کہ وہ ایسی سرکار بنا رہے ہیں جو مٹی کے تیل کو مہنگا کر دے گی۔ اس کا مطلب ہے سرکار ہی اندھی نہیں ہے، غریب بھی اندھے ہیں۔

کل ایک گھر کے آنگن میں دو بلیاں دودھ پی رہی تھیں۔ تو بیا تھا دھن دیکھ رہی تھی مگر بلیوں کو ڈانٹ کر نہیں روک رہی تھی کیونکہ وہ مٹی کے

تیل کا ٹین جسم پر چھڑک چکی تھی اور ماچس کی تیلی لگانے کے لئے جلدی میں تھی۔ بلیوں کو دھکانے کے لئے اس کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ چنانچہ جب اس کا جسم جل رہا تھا تو بلیاں دودھ پیتے پیتے کہہ رہی تھیں "تھینک یو میڈم! آپ نے ہمارا کام بھی آسان کر دیا اور اپنا کام بھی۔ آج آپ ہمیں ٹوکتیں تو ممکن ہے، کل مٹی کا تیل اور مہنگا ہو جاتا ۔۔۔"

کھری کھری

کئی دنوں سے میرا جی چاہ رہا تھا کہ بزدلی چھوڑ دوں اور کھری کھری باتیں کہنا شروع کر دوں یہ ایک احمقانہ خواہش تھی لیکن پھر سوچا، خدا نے مجھے حماقت کے لیے پیدا کیا ہے تو کیوں نہ اس کے حکم کی تعمیل کروں۔ پہلی مرتبہ خدا سے ڈر پیدا ہوا کہ جو انسان ان کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا وہ اسے جہنم میں بھیج دیتا ہے۔

سب سے پہلے میں نے بیوی سے کہا "ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھا لاؤ۔"

وہ بولی "کیا کرنا ہے۔"

"تمہارے سر پر ضرب کرنا ہے، کیوں کہ تم پچھلے دنوں اس امیدوار کو ووٹ دے آئی تھیں جس کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا کہ وہ ایک کرپٹ سرمایہ دار کا چمچہ ہے۔" وہ کہنے لگی۔۔۔ "تو پھر ڈنڈے دو لانا پڑیں گے۔ کیونکہ ضمانت تو اس کی بھی ضبط ہو گئی جسے آپ نے ووٹ دیا تھا۔ لہٰذا دوسرا

ڈنڈا آپ کے سر پر پیش کیا جائے گا۔"

بیوی حق بجانب تھی کیونکہ لیبر دا کی بیوی اس کی سہیلی تھی اور ایشیائی کھیلوں میں میری بیوی کو ایک فری پاس لا کر دیا تھا۔ میں بھی حق بجانب تھا کیونکہ میرا سیاسی ادارہ سوشلزم میں یقین رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ شکست کھانے کے بعد اکالی دل میں شامل ہو گیا تھا۔

ڈنڈے جو ہم میاں بیوی ایک دوسرے پر صرف کرنا چاہتے تھے دراصل وہ فری پاس اور موقع پرست سیاستدان کا سر کچلنے کے لئے اٹھنا چاہئے تھے دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ درد پیٹ میں ہو تو مرہم پٹی کان میں کی جاتی ہے۔

کھری کھری باتیں کہنے کا پہلا چانس غارت ہو گیا۔ غلطی میری تھی کہ اس عورت سے بیاہ کیا جو بیدار ہو گئی تھی۔ ڈنڈا تو صرف اس زمانے میں کارآمد تھا۔ جب عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بیوی سے کہا۔ "گاجر کا حلوہ بناؤ۔"

جب گاجروں کا حلوہ نوش کیا تو وہ ڈنڈے سے زیادہ لذیذ تھا۔

مگر دوسرے دن پھر کسی کو کھری کھری سنانے کے لیے جی مچل اٹھا۔ یوں تو کھری کھری سنانے کے لیئے محلے میں ہر شخص موجود تھا جو انتہائی غلیظ اور بدترین افعال کرتے تھے اور اسے وقت کا تقاضا سمجھتے تھے۔ وقت غلاظتوں کے لیے بے حد موزوں ہو چکا تھا۔

مثلاً ایک ربڑ فیکٹری کے مالک تھے جو ریلوے ویگن میں مال بک کراتے وقت متعلقہ کلرک کو باقاعدہ رشوت دیتے تھے میں اسے رشوت کے لئے ذلیل کر سکتا تھا۔ اسے کہہ سکتا تھا کہ رشوت کے باوجود تم ہر ہفتے آریہ سماج کے مندر میں یگیہ میں شامل ہوتے ہو، گویا مقدس یگیہ کو بھی ذلیل کرتے ہو۔ لیکن اس کھری کھری بات میں ایک قباحت یہ تھی کہ اس ربڑ فیکٹری والے نے میرے ایک نالائق بھتیجے کو فیکٹری میں ملازم رکھ لیا تھا۔ اس دنیا کی ٹریجڈی یہ ہے کہ ہر آدمی ایک دوسرے آدمی کے تلے دبا ہوا ہے۔ کھری کھری کہتا تو بھتیجے کی ملازمت ختم۔ اور نالائقی پھر شروع۔ میری وجہ سے اس کی نالائقی دبی ہوئی تھی۔ مگر پھر سوچا، یہ تو میری بزدلی ہوئی، خود غرضی سے بلند ہو کر بہادر بننا چاہیئے۔

چنانچہ میں نے فیکٹری اونر کو ٹیلی فون کیا "جناب! آپ نے میرے نالائق بھتیجے کو کیا اس لیئے ملازم رکھا ہوا ہے کہ کہیں میں آپ کی رشوت دینے کی خصلت کی رپورٹ نہ کر دوں۔؟"

جواب آیا۔ "ہی ہی ہی۔" اس ہی ہی ہی کا مطلب تھا۔ "اجی، میں تو آپ کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں، جتنا اس رشوت خور کلرک کا۔"

میں نے کہا۔ "ہی ہی ہی کا فراڈ چھوڑیئے۔ آریہ سماج کو بھی داغدار مت بنایئے۔ رشوت دینے کی غلاظت کی بدبو سے بھی ہمارے سوشلسٹ ڈھانچے کو ذلیل مت کیجیئے، چاہے اس کے لیئے میرے بھتیجے کو نوکری سے نکال دیجئے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس کے پاس تو ایک ہی خاموش

جواب تھا کہ میرے بھتیجے کو ملازمت سے جواب نہیں دیا۔ مگر واقعہ یہ ہوا کہ میرے بھتیجے نے بھی میرے ساتھ بول چال بند کر دی اور اس فیکٹری کے اونر نے بھی۔ کھری بات کہنے پر میری زندگی سے دو آدمی نکل گئے۔ افسوس ہوا، لیکن بزدلی ختم کرنا ہو تو افسوس کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک اور آئی سی ایس افسر تھے۔ اپنی خوش قسمتی اور میری بدقسمتی سے میرے رشتہ دار تھے، چونکہ کمپٹ افسر تھے، اس لیے رشتہ داری کو ضمنی حیثیت دیتے تھے۔ میرا احترام کرتے تھے، کیونکہ اہل قلم ہونے کے سبب کئی لوگ میرا احترام کرتے تھے۔ اس لیے وہ آئی سی ایس آفیسر بھی..... بلکہ لوگ میری تعریف کرتے تو وہ آفیسر صاحب بڑے فخر سے کہا کرتے، وہ میرے رشتہ دار ہیں، دور سے انکل لگتے ہیں۔

یہ آفیسر صاحب جب کالج میں پڑھتے تھے تو جن سنگھی تھے، ڈپٹی کمشنر بن گئے تو کانگریس گورنمنٹ کا حلف وفاداری بھی اٹھایا اور جن سنگھ کی خفیہ امداد بھی کرتے رہے۔ نہ جانے ہماری ہندوستانی قوم میں یہ خاصہ کیوں پیدا ہوا کہ صید سے بھی ہمدردی کرتے اور صیاد کے بھی گن گاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ پورا الگ جن سنگھی لگتا ہے، ویسے میں نے کئی کانگریسیوں کو بھی انٹی مسلم اور انٹی سکھ دیکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن سنگھ اور اکالی دل نے ایک مرتبہ پنجاب میں یونائیٹڈ فرنٹ گورنمنٹ بنائی تھی اور عوام کی ہڈیاں بیچ بیچ کر بنک بیلنس اور بڑھا لیا تھا۔

بہرکیف میں کل اس آئی سی ایس رشتے دار کے گھر چلا گیا وہ ایک شاندار کوٹھی میں مقیم تھا۔ مقوی ناشتہ کھانے کے بعد میں نے اُسے کھری کھری سنائی اور کہا۔

"برخوردار! تم بے ایمان ہو۔"

وہ بولا۔ "کیا کروں انکل! مجبوری ہے۔"

"اگر تم یہ کوٹھی رشوت کے پیسے سے نہ بناتے تو کیا حرج تھا۔"

"حلال کی کمائی سے تو جھگی جھونپڑی بھی نہیں بن سکتی انکل!"

"تم نے جن سنگھ کی بھارتیہ سنسکرتی کو رسوا کر دیا۔"

"میں اب جن سنگھی نہیں رہا۔ سرکار کا وفادار ہوں۔"

"اگر جن سنگھ کی سرکار آجائے تو؟"

"تو اس کا وفادار بن جاؤں گا ــــ آپ کو کوئی تکلیف ہو تو دور کر دوں گا۔"

"مجھے ایک تکلیف ہے، بدنیتوں کو کھری کھری سنانے کی ــــ"

"کیا اب مجھ سے ملاقات کر کے وہ تکلیف دور ہو گئی۔؟"

"ہو گئی ــــ"

پانی میں ملاوٹ

دہلی میونسپل کارپوریشن کے ایک افسر میرے دوست ہیں۔ رشوت لیتے ہیں مگر پھر بھی میرے دوست ہیں (بظاہر شرم کی بات ہے اُن کے لیئے نہیں! میرے لیئے) سال بھر میں رشوت کی جتنی کمائی کرتے ہیں اس میں سے ایک بٹہ آٹھ حصہ وشنو دیوی کی یاترا میں بھینٹ کر آتے ہیں (بظاہر یہ بھی شرم کی بات ہے ان کے لیئے نہیں! وشنو دیوی جی کے لیئے)

کل وہ ایک کشمیری دوست کے بیٹے کی برات میں مل گئے۔ اعلیٰ کھدر کا لباس زیب تن کیئے ہوئے۔ بقول ان کے اب میونسپل کارپوریشن میں چونکہ کانگریس برسر اقتدار آگئی ہے اس لیئے اب میں ہفتے میں دو چار دن کھدر پوشی ضرور کرتا ہوں کہنے لگے کھدر کا لباس پہن کر رشوت لینے میں اور آسانی ہو جاتی ہے یہ کہہ کر ہنسنے لگے کیا بے ساختگی کا زمانہ ہے کہ رشوت کا تناظر اب ہنسی سے ہو گیا ہے۔

ہنسی بھی اب خالص نہیں رہی اس میں رشوت کی ملاوٹ ہوگئی ہے۔

میں نے کہا۔ "گپتا جی! کیا حال چال ہے۔" آپ دہلی کے کسی باشندے کو گپتا کہہ دیں وہ گپتا ہی نکلے گا۔ وہ بولے "اوپر بھگوان، نیچے سرکار۔ دونوں کی مجھ پر دیا ہے۔"

میں نے بھگوان کو تو آؤٹ آف ڈیٹ سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر سرکار کو اپ ٹو ڈیٹ سمجھ کر پوچھا "ایک بات بتایئے، آپ کی جو میونسپل کمشنر سرکار ہے، وہ ہر برس پانی کا ریٹ کیوں بڑھا دیتی ہے۔"

بولے۔ "اجی فکر صاحب! کیا کیا جائے جمنا ندی کے پانی میں دہلی کے تمام گھروں کا گندا کوڑا کرکٹ اور گندے جراثیم شامل ہو جاتے ہیں۔ انھیں صاف ستھرا کرنے کے لیے جو کیمیکل استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہر سال مہنگے ہو جاتے ہیں اس لیے مجبوری ہے ریٹ بڑھانا ہی پڑتا ہے۔"

میں کانپ اٹھا پوچھا "کیمیکل کے باوجود ہم جو بظاہر صاف ستھرا پانی پیتے ہیں ان میں کوڑا کرکٹ اور گندگی کے اثرات پوری طرح فنا نہیں ہوتے ہوں گے۔ گویا اس کا مطلب ہے ہم روز ملاوٹی پانی پیتے ہیں۔ کیا سرکار اس کا تدارک نہیں کر سکتی؟

ان کا جواب تھا کہ خود سرکار اپنا تدارک نہیں کر سکتی تو پانی کا تدارک کیا کرے گی اور یوں بھی سرکار کے پاس ٹائم نہیں ہے، ہر دوسرے تیسرے مہینے چیف منسٹر بدلنا پڑتے ہیں۔ ایسے میں ٹائم کہاں ملتا ہے اور یوں بھی ملاوٹ کا تدارک کرنے کی ضرورت اب نہیں رہی کیونکہ ملاوٹ اب ہماری تہذیب

تلک دھاری نے ایک اور وحشیانہ لات جمائی "ابے ماں کے یار! اپنی فلاسفی مت چھانٹ! تیرے جیسے جھوٹے فلاسفی والے چوروں کی وجہ سے تو ہندوستان تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

اور پھر واقعی ایک پولیس کانسٹبل آ گیا، لڑکے کو کان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور تھانے لے کر چلا گیا۔ بعد میں پولیس کے ایک بھیدی نے مجھے بتایا کہ علاقہ پولیس ایسی عمر کے ایک اور لونڈے کی تلاش میں سرگرداں تھی جو چھوٹی موٹی کئی چوریاں کر چکا تھا، مگر پولیس کی گرفت میں نہیں آتا تھا۔

اب یہ لڑکا ان کی گرفت میں آ گیا دوسرے مجرم لڑکے کی ساری وارداتیں وہ اس کیلا چور لڑکے کے سر تھوپ دیں گے۔ اور اسے عبرتناک سزا دلوائیں گے۔ ہندوستان میں کیلے سے بھوک مٹانے والے چور کو سزا دی جاتی ہے۔ مگر مرغیوں کے چور انکم ٹیکس افسر کو سزا نہیں دی جاتی کیونکہ وہ گاہک بیوپاری سے مرغیاں بطور رشوت نہیں بطور تحفہ منگوا لیتا ہے۔

حالانکہ کیلا بھی کھانے کے کام آتا ہے اور مرغی بھی مگر ہندوستان میں چوری سے بچنے کے بھی طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک محلہ میں گھر گھر چوریاں ہونے لگیں تو ایک گھر والے نے اپنے گھر کے باہر یہ بورڈ لکھ کر لگوا دیا "چور صاحبان! اس گھر میں ایک بار چوری ہو چکی ہے۔ برائے کرم اب کسی دوسرے گھر کی طرف رجوع کریں۔"

بن گئی ہے۔ اب دیکھئے کل ایک صاحب مجھے دس دس روپے کے پانچ نوٹ بطور رشوت دے گئے اس میں ایک دس کا نوٹ ملاوٹی تھا، بتایئے آپ اسے کیا کہیں گے۔

میں نے کہا۔ "میں تو اسے بھی تہذیب کہوں گا۔"

ہنس پڑے اور بولے "میں نے بھی اسے تہذیب سمجھ کر دس روپے کا وہ نوٹ ایک ماڈرن بھکاری جو سوٹڈ بوٹڈ تھا اسے دان میں دے دیا کیونکہ وہ ایک مندر کی تعمیر کے لیئے دان مانگتا پھرتا ہے۔"

جواباً میں بھی ہنس پڑا، آج کل رونا چاہو تو بھی جب تک آپ ہنسیں نہیں، آنسو نہیں نکلتے۔ ہنسی بھی آنسو نکلنے کا منبع بن گئی ہے اور پھر ہنس کر کہا "ونڈرفل گپتا جی! اگر وہ مندر تعمیر ہوا تو اس میں بھی ملاوٹی روپے شامل ہوں گے۔ روپے بھی ملاوٹی۔ مندر بھی ملاوٹی۔"

"ہاں" وہ بولے "بشرطیکہ وہ مندر تعمیر ہوا۔ آج کل بیسیوں سے تعلیم یافتہ نوجوان کسی نہ کسی مندر کی تعمیر کے لیئے دان مانگتے پھرتے ہیں، جتنے روپے جمع کر لیتے ہیں ان سے اپنے آپ کو تو تعمیر کر لیتے ہیں مگر مندر تعمیر نہیں ہوتا۔"

"مگر مندر کا سنگِ بنیاد تو کسی نہ کسی وزیر سے ہی رکھوایا جاتا ہے۔"

"ہاں، سنگِ تعمیر سے آگے نہ مندر بڑھتا ہے نہ وزیر ـــــ ملاوٹی زمانے میں چیزیں گل سڑ جاتی ہیں آگے نہیں بڑھتیں۔"

یہ کہہ کر گپتا صاحب تو ایک سیب کھانے کے لیئے فروٹ شاپ کی طرف بڑھ گئے، میں آگے نہیں بڑھا کہ کہیں یہ سیب بھی ملاوٹی نہ ہو۔

دو چار دن پہلے میں نے اخبار میں دودھ پوڈر کی ایک بوتل کی شائع کردہ فوٹو دیکھی۔ بوتل میں ایک مردہ چوہا تھا۔ فوٹو چوہے کی بھی چھپی ہوئی تھی، بڑا خوش قسمت چوہا تھا۔ جس نے بغیر ایک پیسہ ادا کیے مفت میں اپنا فوٹو کھنچوا لیا ورنہ چوہا کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا جو اخبار میں فوٹو کھنچوا کر عوام میں اپنا سماجی رتبہ بڑھا لیتے ہیں۔

کہیں یہ چوہا بھی کوئی سیاسی لیڈر نہ ہو (بلکہ کئی سیاسی لیڈر بھی چوہے ہوتے ہیں جو عوام کی جیبیں کاٹتے ہیں۔) بہرکیف چوہے کے نصیب اس وقت جاگے جب ملاوٹ کی تہذیب آچکی تھی۔ یہ ملاوٹ ہی کی برکت تھی کہ چوہے کا فوٹو بھی اخبار میں چھپ گیا چوہا اس ملاوٹ کی تہذیب سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا اگر فوٹو کھنچوانا ہو تو ملک ڈبو والی دودھ کی بوتل میں بطور ملاوٹ شامل ہو جاؤ۔ اندھی ایڈمنسٹریشن ہے۔ بھلا اندھا کیا چیک کرے گا کہ بوتل میں چوہا اپنی ملاوٹ کر رہا ہے اگر خدانخواستہ ایڈمنسٹریشن اندھی نہیں ہوگی پھر بھی مجھے دیکھ نہیں سکے گی۔ کیونکہ آج کل کی ایڈمنسٹریشن آنکھ تو رکھتی ہے مگر دیکھ نہیں سکتی اور اگر دیکھ سکتی ہے تو دیکھنا چاہتی بھی نہیں کیونکہ وہ سوچتی ہے، جب ملاوٹ عام ہے تو ہم کیوں چوہے کو دودھ کی بوتل میں ملاوٹ کا اشتہار بننے سے روک دیں، جمہوریت کے زمانے میں جب بڑے بڑے صنعت کار ملاوٹی چیزیں تیار کر کے بیچ رہے ہیں تو چوہے کو بھی آزادی ہے۔ کسی نہ کسی خوراک کی چیز میں مل جائے۔

کل ایک صاحب میرے گھر آئے۔ تہذیب کی اعلیٰ روایت یہ ہے کہ گھر آئے مہمان کو چائے کا ایک کپ پیش کیا جائے۔ چنانچہ میں نے جب چائے کا

کپ پیش کر کے کہا "نوش فرمایئے۔"
تو وہ بولے "میں نہیں پیوں گا"
"کیوں؟ اسے سنگرتی سمجھ کر پی لیجئے۔"
کہنے لگے "سنگرتی کیسی؟" جانتے ہیں آپ؟ چائے کا ایک کپ کیسے بنتا ہے۔ ایک تو چائے کی پتی، وہ بھی ملاوٹی ہوتی ہے۔ دوسرے چینی، اور چینی بھی ملاوٹی ہوتی ہے اور تیسرا پانی؟ اور پانی میں بھی جمنا کے گوبر کرکٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

میں شرمندہ ہو گیا۔ اور کہا "تو شربت کا گلاس لاؤں؟"
وہ بولے "شربت بھی آج کل ملاوٹی بن رہے ہیں اور دیکھئے کھانے کی کوئی چیز میرے سامنے مت لائیے گا، بسکٹ، پکوڑے، مٹھائی۔ ہر شئے ملاوٹی۔"
میں نے سگریٹ پیش کیا انھوں نے کہا اس کے تمباکو میں ملاوٹ ہے اور وہ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے "میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس ملک میں نہ کوئی چیز کھاؤں گا نہ پیوں گا، زمانے کی یوں ہی تو پوری نسل ملاوٹی اشیاء کے ذریعہ زندگی گزار رہی ہے۔ آپ سے مل لیا بس یہی غنیمت ہے۔"
میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "تو کیا میں ملاوٹی نہیں ہوں، جناب! شاید آپ نہیں جانتے کہ میونسپل کارپوریشن کے ایک رشوت خور افسر کی ہستی مجھ میں ملی ہوئی ہے۔"

نکتہ چینی کرتا ہے

اگر خدا نے دنیا میں نکتہ چیں پیدا نہ کیئے ہوتے تو خود خدا پر نکتہ چینی کی جاتی کہ اُس نے نکتہ چیں کیوں پیدا نہیں کیئے۔

میرے ایک دوست ہیں اب تو ان پر خدا کا فضل ہو گیا ہے کہ میرے دشمن بن چکے ہیں۔ لیکن جب دوست تھے تو روزانہ کہیں نہ کہیں سے مجھے ڈھونڈ نکالتے اور روزانہ لوگوں کی پانچ چھ نکتہ چینیاں مجھ پر انڈیل دیتے۔ کئی مرتبہ ایک دو نکتہ چینیاں بھول بھی جاتے مگر دوسرے دن اُن ایک دو کو بھی تازہ ترین نکتہ چینیوں میں شامل کر کے "ایڈیشن" پورا کر لیتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے پڑوسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مجھے کہا۔

"دیکھئے فکر صاحب! ہمارے پڑوسی صاحب کو یوں تو کتے رکھنے کا بڑا شوق ہے۔ لیکن وہ میونسپل لا کی اہمیت سے بھی نہیں جانتے کہ کتے کو گھر میں باندھ کر

رکھنا چاہیئے۔ انھیں کھلا نہیں چھوڑنا چاہیئے اگر وہ کسی کو کاٹ کھائے تو چودہ ٹیکے لگوانے پڑیں گے چودہ۔"

میں نے کہا۔ "شرما جی اگر یہ بات آپ مجھے کل بتا چکے ہیں۔ شاید بھول گئے کہ یہ بات بھی ایریمز میں شامل ہے۔"

اپنے اوپر نکتہ چینی کرتے ہوئے بولے۔ "بس دیکھا، یہی مجھ میں نقص ہے کہ بھول جاتا ہوں۔ ایک یونانی حکیم سے حافظہ کی دوائی حاصل کی۔ رتی بھر فائدہ نہیں ہوا۔ آج کل کے حکیم ہوں یا ڈاکٹر صحیح تشخیص تو کر ہی نہیں سکتے۔ آہ! نجانے اس ملک کا کیا بنے گا۔"

میں نے کہا "ہونا کیا ہے، اس ملک کا حافظہ خراب ہو جائے گا۔"

وہ بولے۔ "اور گورنمنٹ اس کی پرواہ ہی نہیں کرتی، بے حافظہ ملک پر حکومت کرے گی تو میں پوچھتا ہوں۔ ایسی حکومت کب تک چلے گی؟"

غرض شرما جی کے ساتھ آپ کسی پوائنٹ پر بھی گفتگو کریں۔ وہ ہر پوائنٹ پر کوئی نہ کوئی نکتہ چینی دریافت کر لیں گے۔ نکتہ چینی ان کی خوراک ہے۔ جسے کھا کر وہ بڑے اطمینان کی نیند سوتے ہیں۔ اطمینان کی نیند کی وجہ میں خود ہوں۔ کیونکہ میں ان کی کسی نکتہ چینی پر نکتہ چینی نہیں کرتا۔ اتفاق رائے میرا شیوہ ہے۔ اسی لئے وہ مجھے دنیا کا اتنا شریف اور معقول آدمی سمجھتے ہیں کہ اپنی اتنی شرافت اور معقولیت پر مجھے خود بھی اعتبار نہیں آتا۔ مگر پھر بھی میرا اس سے کچھ بگڑتا نہیں اور انھیں سکھ کی نیند آجاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اپنی نکتہ چینیاں سنانے کے لیے وہ ہمیشہ میرا ہی تعاقب کرتے ہیں۔ حسن اتفاق سے ایک دن وہ مسائل

تک رورو کے باوجود مجھے پا نہیں سکے تو بقول ان کے رات بھر کوشش کرتے رہے - میری بیوی کا بیان ہے کہ رات کے دو بجے اُن کا ٹیلیفون آیا - پھر تین بجے پھر چار بجے تو میں نے ٹیلیفون کا رسیور اُتار کر رکھ دیا - دوسرے دن ملاقات ہوئی - اور پہلوانوں کے اکھاڑے میں ہوئی چھوٹتے ہی بولے یہ رات بھر آپ کا ٹیلیفون خراب تھا ہمارے محکمۂ ٹیلیفون میں اتنی زیادہ ہے کہ پچاس مرتبہ کمپلینٹ کرو، کوئی سنتا ہی نہیں -"

میں نے کہا "جی فرمایا کمپلینٹ کاغذ پہ نوٹ کر لیتے ہیں محکمہ کاغذ سے آگے نہیں بڑھتے - مگر شرما جی، میرا ٹیلیفون تو ٹھیک کام کر رہا تھا"

بولے "تو پھر رونگ نمبر ملتا رہا ہوگا - رونگ نمبر ملانا تو اس محکمہ کا دستور ہو گیا ہے - بلکہ ایک مرتبہ تو رونگ نمبر ملا - نہ اصلی - کوئی بھی آواز نہیں، یوں لگتا تھا شہر کے سارے ٹیلیفون ڈیڈ ہو چکے ہیں - میں پوچھتا ہوں یہ رونگ نمبر کی بیماری ....؟

میں نے بات ٹوک کر کہا "شرما جی! رانگ آدمی کو ٹیلیفون کرو گے - تو رانگ نمبر ہی ملے گا - مگر یہ بتلائیے کہ آپ پہلوانوں کے اکھاڑے میں کیسے تشریف لے آئے -"

وہ کہنے لگے "بلکہ میرے بجائے آپ بتائیے کہ آپ اکھاڑے میں کیوں آگئے - تھرڈ کلاس پہلوان تھرڈ کلاس اکھاڑہ، تھرڈ کلاس تجارت - آپ کو معلوم نہیں کہ ایسے اکھاڑے آج کل صرف پہلوانوں کی تجارت کے اڈے بن گئے - شرفا کو تو کبھی یہاں نہیں آنا چاہیئے -"

میں نے کہا: "مگر شرما جی! آپ بھی تو تشریف لے آئے۔ کیا آپ اپنے آپ کو شرفا میں شمار نہیں کرتے۔"

اور ان کا جواب تھا: "بلیک کی ٹکٹ خرید کر اندر آیا ہوں۔ تو کون مجھے شرفا میں شمار کرے گا۔ مگر میں تو صرف آپ سے ملنے کی خاطر ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آیا ہوں۔ رات بھر نیند نہیں آئی آخر آپ کل دن بھر کہاں غائب رہے؟"

اور جب میں نے انھیں بتایا کہ صبح بیوی کے ساتھ میری تو تو میں میں ہو گئی تھی۔ بلکہ تو تو بھی میں کر رہا تھا اور میں میں بھی میں، اور پھر مشتعل ہو کر ایک فلم دیکھنے چلا گیا، پھر ایک کے بعد دوسری فلم، پھر تیسری۔"

میری بات سن کر کہنے لگے: "فکر صاحب! میں بھی تو اپنی بیوی ہی کی ایک بات سنانے کے لیے مضطرب تھا، اور دن بھر آپ کو ڈھونڈتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے یہ بیویاں کیوں پیدا کر دی ہیں۔ اگر دنیا میں عورتیں مرد ہوتے تو کیا خدا کی مخلوق ادھوری رہ جاتی۔؟

میں نے کہا: "چلو خیر! خدا سے تو کسی اور مناسب موقع پر نپٹ لیں گے۔ مگر آپ کی بیوی سے آپ کے تعلقات میں گڑبڑ؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تو بڑی شریف خاتون ہیں۔"

"وہ بولے: "ہو گی شریف، مگر شاید میکے میں شریف ہو گی۔ جب وہ کنواری تھی۔

میں اُن سے کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے گھر میں جو اُس کی ڈولی اُتری۔ تو آپ کی صحبت کا اثر اس کی شریف النفسی پر لازماً پڑتا تھا۔ ہر گھر کی اپنی الگ برکت ہوتی

ہے۔ آپ کے گھر کی برکت نے اس کی شرافت غائب کر دی۔ جبکہ میکے میں باقاعدہ موجود تھی۔

مگر میں یہ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ سچ ہمیشہ نہیں بولا جا سکتا بہر کیف میں نے اتنا ضرور پوچھ لیا۔

"گھر میں تنازعہ کی وجہ کیا تھی؟"

وہ بولے "وجہ معقول تھی۔ کثیر نے ایک دوست سے مجھے ٹیگور کی جاذب نظر تصویر فریم سمیت پیش کی۔ اگرچہ تصویر اچھی تھی، فریم اچھا نہیں تھا۔ اجی، وہ پیچھے آج کل کے فریم میکر بڑے چار سو بیس ہیں۔ مجھے تو ان فریم میکروں پر سخت طیش آتا ہے۔ کہ اے جاہلو! تصویر کے کلر کے ساتھ فریم کی کلر اسکیم تو بنا لو۔ نالائق کہیں کے؟"

میں نے کہا۔ "خیر آپ کو ان کی چار سو بیسی اور نالائقی برداشت کر لینی چاہیئے تھی کیونکہ وہ آپ کو ایک دوست سے بطور تحفہ ملی تھی، معاف کیجئے، تحفہ میں چار سو بیسی نہیں تصویر ملی تھی۔ اچھا خیر، تو پھر .....؟"

"پھر کیا جی! میں نے کمرے کی دائیں دیوار پر تصویر لٹکا دی۔ مگر بیوی ضد کرنے لگی کہ تصویر بائیں دیوار پر زیادہ پرکشش لگے گی ــــ میں نے کہا۔ اجی بائیں دیوار پر تو تصویر یوں لگے گی، جیسے تم میرے ساتھ لگی ہو۔ اس فقرے پر وہ بھڑک اٹھی۔ اور دائیں دیوار پر ہی ہزار نکتہ چینیاں کرنے لگی۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "گویا نکتہ چیں کے مقابلہ پر نکتہ چیں بیدار ہو گیا۔"

وہ بولے۔ "کیا فرمایا۔ کیا میں نکتہ چیں ہوں۔ کیا دائیں دیوار پر تصویر لگانا

نکتہ چینی میں داخل ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ ہر نکتہ چیں کی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے آپ کو نکتہ چیں نہیں سمجھتا۔ بلکہ صالح رائے کا مالک سمجھتا ہے۔ دوسرے آدمی کی نکتہ چینی کو وہ برداشت نہیں کرتا۔ مگر نہیں جانتا کہ اس کی اپنی نکتہ چینی کو بھی لوگ برداشت نہیں کرتے۔ اگر نکتہ چیں اپنی نکتہ چینی پر خاموش رہ جاتا ہے۔ صرف اپنی تفریح طبع کے لئے فکر تونسوی بن جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی بیوی بھی فکر تونسوی بن جائے گی۔ ورنہ ٹیگور کی تصویریں دیوار پر لگائی جائے یا بائیں دیوار پر۔ ٹیگور کی تصویر کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ کوئی نکتہ چینی نہیں کرتی۔

بہرکیف میں نے شرما جی کو طیش میں آنے سے روک لیا۔ پیٹھ پر دو چار تھپکیاں دیں اور کہہ دیا کہ آپ کا نقطۂ نگاہ صحیح تھا۔ آپ کی بیوی غلط تھی۔ اور آپ نے صحیح فرمایا کہ خدا آخر بیویوں کو کیوں پیدا کرتا ہے۔ اگر صرف خاوند پیدا کرتا۔ تو کتنی آسانی رہتی۔ کس اطمینان سے ٹیگور کی تصویر آویزاں کر دی جاتی۔

مگر آہ! شرما جی کو معلوم نہیں تھا کہ نکتہ چینی اس کے لئے خدا کی دین تھی۔ نکتہ چینی سے آپ کو جو تکلف و سکون حاصل ہوتا ہے اور مزے کی نیند آتی ہے۔ بیوی نہ ہوتی تو آپ اس تکلف اور نیند سے بھی محروم ہو جاتے۔

شرما جی سے میری دوستی، دشمنی میں اس وقت بدلی۔ جب ان کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ ہمیشہ نکتہ چینی کیا کرتے تھے کہ شادیاں رات کو نہیں دن کو ہونی چاہئیں لوگ خواہ مخواہ رات کو شادیاں کر کے اپنا بجلی کا خرچ بڑھا لیتے ہیں۔ بلکہ رات کی شادیوں پر تو بجلی کی سپلائی ہی سرکار کو بند کر دینی چاہیئے۔

لیکن جب ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تو رات کو ہوئی۔ اور جب برات ڈھول ڈھمکے اور بینڈ باجے کے ساتھ ان کے گھر پر پہنچی تو اچانک بجلی فیل ہو گئی اور میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا "شرما جی! اور کرو نکتہ چینی رات کی شادی پر۔ اب دیکھو لو خود تمہارے ہاں بجلی فیل ہو گئی۔ خود میاں فضیحت دیگراں را نصیحت؟"

وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ بولے "یہ بجلی آپ نے بند کرائی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یہ خدا کا کرشمہ ہے۔"

اس پر ہماری خواہ مخواہ تو تو میں میں ہو گئی، کچی دوستی پکی دشمنی میں بدل گئی۔ اور آج کل جب بھی مجھے شرما جی کی یاد آتی ہے تو میں غالب کا یہ شعر پڑھ لیتا ہوں کہ ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

"Forwarded with compliments of the
Ministry of Education, Govt. of India"

او ماں! او بھارت ماں!!

ہندوستان میں عورت کو اردھنگنی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ کافی مشکل لفظ ہے، اس لیے ہندوستانی خاوند جب اپنی بیوی کو پکارتا ہے تو کہتا ہے "ہیں نے کہا جی۔ — گویا یہ اردھنگنی کا آسان ترجمہ ہے۔ اور بیوی سمجھ جاتی ہے کہ مجھے ہی آواز دی جا رہی ہے۔ ورنہ اگر خاوند بیوی کو پکارے "اردھنگنی"! تو بیوی کچن سے جواب دے گی یہاں کوئی اردھنگنی شردھنگنی نہیں رہتی۔"

مگر کچھ خاوند ایسے ہیں جو ہندوستانی اناج کھاتے ہیں، مگر ہندوستانی معاشرے سے دور ہٹ کر چلتے ہیں۔ وہ خود حیران ہیں کہ اناج تو انہیں ہضم ہو جاتا ہے مگر معاشرہ کیوں ہضم نہیں ہوتا۔ انھیں سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ نقص کس میں ہے؟ اناج میں ہے یا معاشرے میں ہے یا خود اُن میں — بہر کیف انہوں نے اردھنگنی کا لفظ ترک کر دیا۔ کہ یہ تو کسی بودھی زبان کا لفظ ہے،

میرے ایک دوست ہیں

میرے ایک دوست ہیں دراصل وہ میرے دوست اس لیئے بن گئے ہیں کہ ان کے والد صاحب میرے دوست تھے۔ اور ان کے والد صاحب سے میری دوستی اس لیئے تھی کہ ان کے والد صاحب کے والد صاحب سے میرے والد صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے۔

یعنی یہ دوستی ہڈیوں کی بدولت نہیں۔ نسلوں کی بدولت چلی آرہی ہے۔ جس طرح کئی قبائل کی دشمنی نسلوں تک چلتی رہتی ہے مثلاً ایک صاحب نے جو اب پی ایچ ڈی کی ڈگری تک حاصل کر چکے ہیں مجھے بتایا کہ میرے جھروا دادا نے ایک خاندان میں اپنی بیٹی کا ازدواجی رشتہ قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بڑے تکبر سے کہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کنجروں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ دونوں طرف کی چوتھی نسل تک ایک دوسرے کو کنجر کہتی ہے۔ سوشل تعلقات سفر

ہو کر رہ گئے ہیں۔

چنانچہ میرے جو دوست ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں وہ میرا احترام کرتے ہیں۔ وہ دیوالی پر میرے گھر میں مٹھائی بھیجتے ہیں میں ان کے گھر میں مٹھائی بھیجتا ہوں۔ (اگرچہ حلوائی مختلف ہوتے ہیں) ان کے یہاں بیٹی کی شادی ہو تو ہم دلھن کی خدمت میں اکیس روپے بھینٹ کرتے ہیں۔ زیادہ اس لیے نہیں کرتے کیونکہ انھوں نے بھی ہمارے یہاں شادی پر اکیس روپے ہی دیئے تھے۔ غرض ہم نے سٹیٹس کو اتنا ضرور برقرار رکھا ہے کہ دوستی، دوستی ہی رہے۔ صفر نہ بن جائے۔

گذشتہ دنوں مجھے ان کا ٹیلیفون آیا۔ دوستانہ لہجے میں پوچھنے لگے "اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آسام چلا جاؤں۔؟"

میں اگر دوستانہ مناسبت برتتا تو انھیں کہہ سکتا تھا کہ آسام مت جائیے۔ کیونکہ وہاں گولیاں چلنے کا رواج چل پڑا ہے کون جانے آپ وہاں سے صحیح سلامت لوٹ پائیں یا نہیں۔ کیونکہ گولی اندھی ہوتی ہے۔ دیکھ نہیں سکتی کہ کس شخصیت کا بدن چیر کر باہر جا رہی ہے۔

میں نے کہا "ضرور چلے جائیے۔ کیونکہ مقام واردات پر ہی جا کر آسام کی سمیسا سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ایر کنڈیشنڈ کمرے میں تلی ہوئی مچھلی کھاتے رہنے سے سمیسا نہیں سمجھی جا سکتی۔ سمیسا کو الجھانے کے لیے ہی ایر کنڈیشنڈ کمرے بنائے جاتے ہیں۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے اس مشورے میں دوستی پوشیدہ تھی یا دشمنی، یا غیر جانب داری۔ میں نے اکثر غیر جانب دار حضرات کو دیکھا ہے کہ بھاری بینک

بیلنس کے باوجود صفر دکھائی دیتے ہیں۔

مگر چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ میرے وہ دوست آسام نہیں گئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ کیونکہ سُنا گیا ہے کہ وہاں اب بربریت زدہ غارت گری مدھم پڑ گئی ہے اور وہاں الیکشن کے بعد جمہوریت پیدا ہو گئی ہے۔ اور ہر غارت گری کے بعد چونکہ حالات کو بدل جانے کا سنہری موقعہ مل جاتا ہے اس لیئے عین ممکن ہے آسام سے اب پھر اپنے نئے پرانی مرکزی سرکار سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لیئے دہلی آنے جانے لگیں۔ فائیو سٹار ہوٹل میں مرغن کھانے کھائیں اور یہ کہہ کر لوٹ جائیں کہ سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی ہے نئے سرے سے سمجھوتہ فارمولے کے لیئے ہم پھر دہلی آئیں گے۔

آسام نہ جانے پر میں نے انھیں مبارکباد بھیجی جو انہوں نے قبول کر لی۔ بلکہ بطور ہدیہ انھوں نے فوراً نوکر کے ہاتھ مجھے ایک درجن سنگترے بھجوا دیئے۔ جن میں سے دو سنگترے گلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا جب مجھے موقعہ ملا تو ان کے مقابلے پر زیادہ حق دوستی ادا کروں گا۔ یعنی دو کی بجائے تین گلے ہوئے سنگترے بھیجوں گا۔ ہم ہندوستانی آج کل کمپیٹیشن کے موڈ میں ہیں اپنے مقابلے پر دوسرے کو پچھاڑ دیتے ہیں۔

گزشتہ دنوں مجھے وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مل گئے۔ میں وہاں ایک فلم پروڈیوسر کی بیٹی کی شادی پر گیا ہوا تھا۔ ہماری پرانی تہذیبی روایت یہ تھی کہ دولہا کی بارات بجتی ہوئی شہنائیوں کے ساتھ دلھن کے گھر جاتی تھی۔ لیکن اب ہم نے تہذیب کو متروک کر دیا ہے ترقی یافتہ کہلانے کے لیئے تہذیب کے گلے پر

چھری چلانا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیئے فائیو سٹار ہوٹل کو گھر بنا لیا گیا ہے۔ کرائے کا گھر، دو تین گھنٹوں کا گھر، اور کرایہ دو تین ہزار روپیہ، فلم پروڈیوسر اس کرائے کو یوں سمجھتے ہیں۔ جیسے ایک آگ اگر کے ہاتھ پر دس پندرہ پیسے عرض کر دیئے۔

اس محفل میں مجھے وہ دوست بھی نظر آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی بیتابانہ میری طرف لپکے۔ بولے:

"میرا ایک حقیر کام تو کر دیجئے۔"

میں نے کہا۔ "فرمائیے!"

"اس فلم پروڈیوسر سے میرا تعارف تو کرا دیجئے۔"

"اجی چھوڑیئے۔ آپ کو یہ ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

بولے۔ "یار! دراصل میں سوشل اور کلچرل دائرے میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

"کیوں، کیوں؟"

"آپ نہیں جانتے پچھلے دنوں مجھے ایک منظور شدہ سرکاری کالونی تعمیر کرنے کا ٹھیکہ ملا تھا جس میں مجھے دس لاکھ روپیہ منافع ہوا ہے اس لیئے میں چاہتا ہوں کہ اب اپنا ایک کلچرل مرتبہ بناؤں۔"

روپیہ ہاتھ میں آ جائے بلکہ خلاف توقع کچھ زیادہ ہی آ جائے تو انسان اس کا کچھ مصرف چاہتا ہے۔ خود لوٹا تو پھر لٹنا بھی چاہتا ہے اور وہ اسے کلچر اور آرٹ پر لٹانا چاہتے تھے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ اس فلم پروڈیوسر پر لعنت بھیجئے آپ کچھ شاعروں کو اپنی کوٹھی پر دعوتِ مے و مینا پیش کیجئے۔

یہ شاعر لوگ نہ صرف مے و مینا کے قدیم ترین بھوکے ہوتے ہیں بلکہ آرٹ اور کلچر کا خود ایک دائرہ بھی ہوتے ہیں۔"

میری اس تجویز پر وہ بیحد جھوم اٹھے اپنی بوجھل جیب میں ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ "ہاں ہاں! میں ایک عظیم الشان دعوت دوں گا۔ میرے پاس وہسکی کی دو بوتلیں ہیں۔ جن کی قیمت پندرہ سو روپے ہے۔ ہائے رے ہائے! میں تو شاعری کا متوالا ہوں۔ تو پھر بتائیے۔ کب ان شعراء کو غریب خانے پر لائیں گے۔ (غریب خانہ پندرہ کمروں پر مشتمل تھا)

بہرکیف دعوت ہوئی۔ شاعر۔ غزلیں، لطیفے، رنگ و رونق، مستیاں، بلکہ خرمستیاں تک۔ تیسرے دن میں نے ان دوست کو ٹیلیفون کیا۔ "دوست! کیا اس کلچرل دائرے سے آپ نے کچھ حاصل کیا؟"

بولے "ابھی میں نے تو خود شاعری شروع کر دی ہے۔ ذرا سنیئے! عرض کیا ہے کہ....."

اور انھوں نے ٹیلیفون پر اپنی ایک بے وزن غزل مجھے سنا دی۔ اور مجھے یوں لگا دس لاکھ روپوں کی بے ایمانی سے ایک بے وزن کلچر کو جنم دینا شروع کیا تھا۔

میرا آج کا پروگرام

میرے روزانہ کے پروگرام میں صبح اور شام کا وقت تو حرام ہو جاتا ہے۔ صبح میرا بڈی مسٹر بھاردواج میرے غریب خانے پر آجاتا ہے۔ سرکار کو گالیاں نکالتا ہے اور پھر کسی سرکاری حاکم کو رشوت وغیرہ دینے کے لیئے نکل جاتا ہے۔ رشوت دینے سے پہلے میرے ہاں سے چائے ضرور پی جاتا ہے۔ یعنی میری چائے کو بھی حرام کر جاتا ہے اور میرے وقت کو بھی۔

اور شام کو میں جس پارک میں چہل قدمی کے لیئے جاتا ہوں۔ وہاں کوئی نہ کوئی تقریر کر رہا ہوتا ہے۔ مگسے پٹے ہوئے چالو نظر سے میرے کانوں کو نہیں، میرے پیروں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔ اور میری چہل قدمی کو حرام کر دیتے ہیں۔

جس ڈاکٹر نے مجھے چہل قدمی کا مشورہ دیا تھا، اس کی میڈیکل سائنس میں

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ چپل قدمی میں لیڈر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور جس شے میں لیڈر شامل ہو جائے، اُس کا مستقبل صحت مند نہیں رہتا۔ مشکوک ہو جاتا ہے۔

لیکن آج کے پروگرام میں، میں نے صبح اور شام کو محفوظ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور بجائے اس کے کہ بھارد واج میرے گھر آئے، میں اُس کے گھر چلا جاؤں۔ وہ شکار کو اپنے فلیٹ میں دیکھ کر جھوم اٹھے گا اور کہے گا۔ "فکر صاحب! میں ثابت کر سکتا ہوں کہ سرکار کا ہر اہلکار رشوت خور ہے۔"

اور میں کہوں گا۔ "کیا آپ کے گھر میں بھینس کا خالص دودھ ہوگا؟ کیونکہ میں نے چائے سے توبہ کر لی ہے۔"

وہ کہے گا "چپڑاسی ایک روپیہ رشوت، کلرک پانچ روپے، اسسٹنٹ پندرہ اور افسر ..... ؟"

اور میرا جواب ہوگا "کیا آپ کے دادا جان شیر کے شکاری تھے۔ سامنے دیوار والی تصویر تو یہی ظاہر کرتی ہے۔"

مگر اُس کا فقرہ ہوگا "میں پوچھتا ہوں اینٹی کرپشن سٹاف ....."

اور میرا فقرہ ہوگا "اور میں پوچھتا ہوں، گلاب کے پھولوں کی خوشبو ....؟"

اور یوں، جب آدھے گھنٹے تک اس کے تمام گھسے پٹے فقروں کو کھدیڑ لائن لگا دوں گا تو امید واثق ہے کہ وہ سرکار کی بجائے مجھے گالیاں دینے لگے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دوران اس کی بیوی مجھے بھینس کے دودھ کا گلاس لا کر پلا چکی ہوگی، جس میں پانی گوالا نہیں ملاتا۔ بھارد واج کی بیوی خود ملاتی ہے۔

واپس گھر لوٹوں گا تو بیوی اعلان کرے گی کہ آپ کو دس بجے نو سے سال کی اُس بڑھیا کی ارتھی میں شامل ہونا ہے جو آپ کے ماموں کی ساس تھی۔ میرا اصول ہے کہ میں ہر ارتھی میں شامل ہو جاتا ہوں، صرف اس غرض سے تاکہ میری ارتھی میں بھی سبھی انکل اور چاچیاں شامل ہوں۔ لیکن میں اپنی بیوی سے کہوں گا کہ آج نو سے سال کی بڑھیا کی ارتھی میں تم شامل ہو جاؤ۔ (کیونکہ تم نو سے سال کی ہو جاؤ گی تو تمہاری ارتھی بھی اٹھے گی) اور مجھے ایک فرینڈم فائیٹر کی ارتھی میں شامل ہونے کے لیئے جانا ہے۔ اس نے ہمیں آزادی کی نعمت عطا کی ہے اور سرکار اسے تین سو روپے ماہانہ امدادی پنشن دیتی تھی۔ چہ جائیکہ اُسے تین سو روپوں کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ ایک کاروبار میں ہزاروں روپے کماتا تھا اور جن گن مین گاتا تھا۔

چنانچہ بیوی مان گئی۔ کیونکہ عورتوں کو ویسے بھی سپاٹے کا شوق ہوتا ہے اور میں اس فرینڈم فائیٹر کی ارتھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر آدھے راستے میں ایک اندوہناک خیال آیا کہ اگر وہاں کوئی وزیر بھی آگیا تو لوگ ارتھی کے بجائے وزیر کے گرد گھومیں گے اس لیئے.....

اس لیئے چمچہ گروں کے ماحول سے اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنے کے لیئے میں نے پروگرام بدل دیا اور اپنے دوست بلدی پرشاد جی کے گھر کا رُخ کر لیا کیونکہ آج اُس کے پوتے کا منڈن سنسکار تھا۔ ایک طرف ارتھی دوسری طرف منڈن، پرانی نسل واپس جا رہی ہے، نئی نسل منڈن کروا کر اپنے گل کھلانا چاہتی ہے۔ کہیں آنسو ہیں تو کہیں تبسم اور مجھے دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

جب بدری پرشاد جی کے گھر پہنچا تو مل کا بچا کھچا باسی پرشاد لے کر لوٹ آیا۔ کیونکہ بقول مسٹر بدری، منڈن سنسکار تو مکمل ہو گیا تھا۔ ہنس کر یہاں تک کہہ دیا کہ آپ کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے، کسی ڈاکٹر کو دکھائیے۔ ایک ڈاکٹر جو واشنگٹن ریٹرن ہے۔ میرا دوست ہے۔ اُسے دکھا دیجئے۔

میں نے کہا "مگر وہ میرا دوست نہیں ہے۔ آپ ہی اپنی موٹر کار میں مجھے بٹھا کر ساتھ لے چلیے۔"

ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "ہائے

موٹر کار کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

میں نے کہا "کیوں؟ موٹر کے ساتھ کونسی دُرگھٹنا ہو گئی؟"

کہنے لگے "پرسوں آپ نے یہ خبر پڑھی ہوگی کہ ساؤتھ دہلی کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا گیا اور ڈاکو ایک کار میں فرار ہو گئے — وہ کار آج ایک سلم ایریا میں کھڑی مل گئی اور ہائے ہائے! کہ وہ میری ہی کار تھی۔"

میں نے کہا "مگر آپ نے تو ایمبیسڈر کار خریدی تھی؟"

"جی ہاں! یہ بالکل وہی تھی"

"دیکھا آپ نے، میرا حافظہ کتنا تیز ہے اور آپ کہہ رہے تھے کہ میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں، اب بتائیے جاؤں یا نہ جاؤں؟"

"کونسے ڈاکٹر کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"ابھی ابھی آپ نے واشنگٹن کے ایک ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا تھا۔"

جسے برہ سمیت ہندوستان سے بھگا دیا گیا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی فرنگی طرز پر نصف بہتر کہتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے ایک خاوند سے پوچھا۔ "اگر بیوی بہتر ہے تو آپ کیا ہیں؟"

وہ کہنے لگا۔ "نصف بدتر۔"

جو خاوند اپنے آپ کو نصف بدتر سمجھتے ہیں۔ یہ صرف وہی حضرات ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو گئے۔ تو انہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے: عورتوں کو بیدار ہو جانا چاہیئے۔ غلطی سے تعلیم میں انقلابی اسپرٹ بھی شامل تھی۔ جسے وہ سمجھ نہیں سکے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عورتیں بیدار ہو گئیں اور پھر انقلابی بھی ہو گئیں۔ یعنی اُدھر وہ بیدار ہوئیں، اُدھر گھر کے کچن ویران ہو گئے۔ خاوند نے شدید اعتراض کیا کہ تم نے صبح مجھے چائے کا کپ بنا کر کیوں نہیں دیا۔؟"

"کیونکہ میں اب بیدار ہو گئی ہوں۔ صدیوں تک ہم عورتیں تم خاوندوں کے لئے چائے کا کپ بن کر جیتی رہیں۔ لیکن اب بیدار ہونے کے بعد یہ غلامی برداشت نہیں کر سکتیں۔"

"لیکن اے بیدار مغز چیونٹی تمہاری بیداری کا نعرہ ہم خاوندوں ہی نے لگایا تھا۔"

"ہاں، لگایا تھا۔ تو اب بھگتو! اٹھ کر خود ایک چائے کا کپ بنا لو۔ میں تو دفتر جا رہی ہوں۔"

"اچھا اچھا، چائے میں بناتا ہوں۔ لیکن تم بھی ذرا میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پی لو۔"

"کیا ہوگا، مجھے یاد نہیں۔"

"آپ کا حافظہ تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہے۔"

اب کیا کروں، کہتا جاؤں؟

جو آدمی بغیر پلاننگ کے دن بھر کے پروگرام پر عمل شروع کرے اس کا یہی حشر ہوتا ہے اور یہ حشر کوئی بُرا نہیں ہوتا ــــ چنانچہ سوچا، ایک ٹھیلے سے پکا ہوا آم خرید کر کھا لوں۔ کھاتے کھاتے کوئی بہتر پروگرام سوجھ جائے گا۔ چنانچہ آم کے ریٹ پر دکاندار سے تو تو میں میں کرتا رہا۔ انسان کے پاس وافر ٹائم ہو تو وہ یا تو سوشل ورکر بن جاتا ہے اور یا کسی نہ کسی سے جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ جھگڑے اور دوستی کو بڑھاتے ہیں دیر نہیں لگتی۔ چنانچہ آدھے گھنٹے تک اس کے ساتھ بحث کرتا رہا۔ ہندو فلاسفی، خلیجی ممالک کی عارضی امیری، پاکستان کا نا جنگ معاہدہ، حتیٰ کہ ایک تو تقریباً ان پڑھ دکاندار سے ٹیگور کی شاعری کا تذکرہ بھی چھیڑ دیا۔ اس دوران اور بہت سے گاہک آ گئے اور دکاندار یہ بھول گیا کہ اس نے میرے آم کے دام مجھ سے نہیں لیے۔ چنانچہ میں بغیر دام کے آم کھا گیا ــــ بغیر دام آم کھانے کا پروگرام آج کے تمام پروگراموں میں سب سے زیادہ لذیذ نکلا۔

آم کھانے کے بعد ہسپتال میں ایک دوست کی بیمار پرسی کے لیے گیا۔ وہ بیہوش تھا، سوچا اس کی ماتم پرسی کے لیے پھر کبھی آ جاؤں گا۔ اور پھر دن ایسے ہی الّم غلّم پروگراموں کے ساتھ نمٹارا کرتا رہا۔ ان پروگراموں میں ایک جگہ لطیفہ بازی بھی چلی اور راستے میں شام ہو گئی۔

شام، خرام نہ ہو جائے۔ اس لیے پارک بدل لیا۔ نئے پارک میں چلا گیا مگر وہاں بھی ایک لیڈر فیملی پلاننگ کی حمایت میں بھاشن دے رہا تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ اس لیڈر کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں ــــ چنانچہ چپل قدمی پر لعنت بھیجی اور گھر لوٹ آیا۔

انتقال، انتقال، انتقال

اس روزانہ اخبار میں ایک مستقل کالم تھا جس میں مختلف انسانوں کے انتقال کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ میں عام طور پر اس کالم کو نظر انداز کر جاتا تھا کہ یہ کالم یا تو خدا کو پڑھنا چاہیے یا مرنے والوں کے رشتے داروں کو۔

انتقال کی سب سے اہم خبر تو وہ ہوتی ہے جب کسی ملک کا کوئی وزیر اعظم مر جائے۔ مگر وہ خبر اس کالم میں غائب ہوتی ہے بلکہ پہلے صفحے کی شہ سرخی بنتی ہے تو اسے وہ لوگ بھی حیرت اور خوشی سے پڑھتے ہیں جن کا اپنا رشتہ دار اس کالم میں انتقال کر چکا ہوتا ہے۔ بلکہ پہلے وزیر اعظم کے انتقال کی خبر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے رشتہ دار کی خبر کو۔ رشتہ دار کی اہمیت بہرکیف ثانوی ہوتی ہے۔

یہ تفاوت تو خیر انسان کے مقدر میں لکھا ہے انسان کو بھی چھوڑ دو جانوروں تک میں یہ تفاوت موجود ہے کہ اگر بادشاہ کا گھوڑا مر جائے تو ہزاروں خدام تعزیت

کو آجاتے ہیں لیکن اگر کوئی چیونٹی مر جائے تو خود مارنے والے کو بھی خبر نہیں ہوتی۔
عوام تو چیونٹی کا رتبہ رکھتے ہیں جنگ میں ہزاروں سپاہی مر جاتے ہیں۔ لیکن ملک کا وزیرِ اعظم اُن کے انتقال پر افسوس نہیں کرتا بلکہ ڈیفینس منسٹر سے یہ خبر سنکر افسوس ضرور کرتا ہے کہ ہمارے کتنے ہوائی جہاز تباہ ہوئے۔ اور تباہ شدہ اسلحہ کا تخمینہ کیا تھا۔

لیکن کل میں نے اس روزانہ اخبار کا انتقالی کالم پڑھ ڈالا۔ کیونکہ اس دن اخبار کی سبھی خبریں بے رس اور بے جان تھیں حتیٰ کہ کسی نوجوان ہریجن لڑکی کی عصمت دری کی خبر بھی نہیں تھی جس کے زمیندار لوگ عام طور پر عادی ہیں۔
بے رس خبریں پڑھ کر جیسے مجھے خیال آیا کہ اخبار ساٹھ پیسے میں خریدا ہے ابھی پوری رقم بھی خرچ نہیں ہوئی۔ اس لیے انتقال والا کالم پڑھنا شروع کر دیا۔
عجیب بات ہے کہ وہ کالم مجھے دلچسپ لگا۔ کالم میں بیس پچیس انسان انتقال کر چکے تھے جس میں سے چند ایک میں تو بڑی دلچسپ معلومات تھیں۔ مثلاً میری عینک لگا کر ذرا انہیں ملاحظہ کیجیے

- رضی صاحب کا حسرتناک انتقال

محکمہ زراعت کے انڈر سیکریٹری جناب عمادالدین رضی صاحب کل شام اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انہیں کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔ صرف ان کی زوجہ محترمہ کے گھٹنوں میں کئی برس سے درد رہتا تھا کل شام رضی صاحب ان کی چھٹی دوائی بدلوانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہے تھے بس پر چڑھنے کی کوشش میں گر گئے۔ سر پھٹ گیا اور وہیں ہلاک ہو گئے۔ گزشتہ برس سے وہ اسکوٹر چھوڑ کر بس پر

جانے لگے تھے۔ کیونکہ پٹرول اتنا مہنگا ہو گیا تھا کہ وہ بس کی معرفت سر تو پھوڑوا سکتے تھے پٹرول نہیں خرید سکتے تھے۔

مرحوم اپنے پیچھے ایک بیوی اور تین بچے چھوڑ گئے۔ بچے چار بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن پچھلے برس انھوں نے نس بندی کروالی تھی۔ سُنا جاتا ہے کہ اللہ نے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

● ایک ٹیچرس کا انتقال پر ملال ـــــ

مشہور ٹیچر اور سوشل ورکر اوشا دیوی جی کی موت واقع ہو گئی۔ وہ پینتالیس کے پیٹے میں تھیں۔ گزشتہ برس ان کا خاوند ایک بنک کے ڈاکے میں گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ بڑا اور اکلوتا لڑکا ایکٹر بننے کے اندھا دھند شوق میں بمبئی بھاگ گیا تھا۔ جو ایکٹر نہ بن سکا۔ تو سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

مرحومہ اوشا دیوی نے اس دہرے غم میں خودکشی نہیں کی بلکہ سوشل ورکر اور ٹیچر بن گئیں غریب غربا کے بچوں کو اپنے گھر میں ہی پڑھایا کرتی تھیں۔ غربا کے دکھ سکھ میں مسلسل شریک ہوتی تھیں اور غربا بھی اگرچہ اپنی محدود جیب کے باعث ٹیوشن کے لیے معمولی پیسے دے سکتے تھے مگر باقاعدہ دیتے تھے، بے ایمانی نہیں کرتے تھے لیکن کل جب وہ بچوں کو بتا رہی تھیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں اور کون کرواتا ہے تو اچانک انھیں ایک زبردست ہچکی آئی اور یہ آخری ہچکی تھی۔

ان کے جنازے میں صرف غربا شامل ہوئے کوئی وزیر شامل نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ ملک کے اہم مسائل سلجھانے میں سخت مصروف تھے۔

• بابا رونق شاہ انتقال کر گئے ـــــ

شہر کے مقبول ترین یونانی حکیم بابا رونق شاہ ہم میں نہیں رہے۔ کل سیڑھیاں اترتے وقت ان کا پاؤں پھسلا اور لڑھکتے لڑھکتے جب فرش پر پہنچے تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

نوے برس کی عمر میں بھی ان کا چہرہ شنگرفی تھا مگر موت برحق ہے شنگرف کو بھی نہیں چھوڑتی مرحوم اپنے پیچھے سیکڑوں مریضوں کو چھوڑ گئے۔ ان کے دو لڑکے ہیں، اور دونوں ولایت میں اعلیٰ مشاہرہ پر ملازم ہیں۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ وہ عمر کی پوری صدی نہیں جی سکے۔

• شاعر حنا کانپوری بھی گئے ـــــ

جب حنا کانپوری کی عمر پینتیس برس (ہائے کیا عمر تھی) جو ہر مشاعرہ لوٹ کر لے جاتے تھے۔ کل ایک ناجائز شراب فروخت کرنے والے کی چھت پر مردہ پائے گئے۔ کوئی کہتا تھا شراب میں ملاوٹ کے سبب وہ رحلت فرما گئے۔ کوئی کہتا تھا انہیں شوگر کی پرانی شکایت تھی اور کوئی انہیں وقتاً فوقتاً پیشاب بند ہو جانے کے عارضے کا شکار بتاتے تھے جگر چھلنی چھلنی ہونے کا مرض بھی انہیں لاحق تھا۔

مگر ان کے قریبی دوستوں کا خیال ہے کہ کل رات مشاعرے میں ان کی سخت ہوٹنگ ہوئی جسے وہ برداشت نہ کر سکے۔

بہر کیف ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی ہے، نتیجے کا انتظار ہے۔

جسے صرف موت شناخت کر سکی ـــــ

کل دوپہر ایک ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت ایک گندے نالے کے قریب سے پائی گئی۔ جو شناخت کے لیے تھانے لے جائی گئی مگر ابھی تک کوئی اُسے پہچان نہ سکا۔ سفید چوڑی اور سفید ساڑھی میں ملبوس یہ عورت کون تھی کہاں سے آئی تھی، کیوں آئی تھی ـــــ آئی تھی یا لائی گئی تھی۔ ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ جب اُسے مُردہ حالت میں پایا گیا۔ تو ساڑھی کھلی ہوئی تھی۔

پولیس کا بیان ہے کہ ہم نے زبردستی عصمت دری کا کیس رجسٹر کر لیا ہے اور تفتیش کی جا رہی ہے (یہ پولیس کی تفتیش ہے جاری بھی رہ سکتی ہے اور پھر اچانک بغیر نتیجہ کے ختم بھی کی جا سکتی ہے)

• تین سالہ بچے کی موت ـــــ

محکمہ معمولات کے ڈائریکٹر جناب سنت نام سنگھ کے معصوم بیٹے امرو اپنی زندگی کے صرف تین سال گزار کر چل بسے۔ افسوس صد افسوس کہ ڈائریکٹر صاحب کے چار بچوں میں یہ واحد بچہ تھا جو ذکی اور ذہین تھا۔ باقی بچے فیملی پلاننگ سے پہلے کی پیداوار تھے اور اس اوسط سے بھی کم ذہانت کے مالک تھے۔

مرحوم بچے میں صرف ایک نقص تھا کہ اس کے کان سے ہفتے میں ایک بار خون کی دو چار بوندیں ٹپکا کرتی تھیں۔ مگر ڈائریکٹر صاحب کا بیان ہے کہ ایسی بوندیں تو کبھی کبھی میرے کان سے بھی ٹپکا کرتی تھیں مگر ان کے باوجود میں ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گیا مگر یہ تین سال کا بچہ؟

تعزیت کرنے والوں کا خیال ہے کہ باپ اور بیٹے میں یہ فرق کیوں پیدا ہوا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ موت کا ایک دن معین ہے۔ کوئی تین سال میں گزر جاتا ہے اور کوئی بہتر سال تک گزرنے میں نہیں آتا۔

اوپر عرش نیچے فرش

سردی کے موسم میں جب سردی بھی سردی سے کانپ رہی ہوتی ہے میں نے ایک ٹٹ پاتھ پر دیکھا۔ جنگلے کے ساتھ ایک مکان کھڑا ہوا تھا اس کی دیواریں پتلی چادر سے چنی گئی تھیں، پتلی چادر کے ایک ٹکڑے سے چھت تیار کی گئی تھی۔ مکان کا دروازہ آدھا کھلا، آدھا بند تھا۔ آرکی ٹیکٹ کا یہ کمال دیکھ کر مجھے آزاد ہندوستان کی بلند خیالی پر حیرت تو ہوئی لیکن مسرت بھی ہوئی۔

میں نے جھانک کر دیکھا! ایک نیم زندہ، نیم مردہ سا شخص اس مکان میں سویا ہوا نحوا ستراحت تھا۔ میری عینک کا نمبر چونکہ بالکل صحیح تھا اس لیے عینک نے بالکل صحیح بتایا کہ سویا ہوا شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے ادھکڑ دھوتی اور تین چوتھائی بنیائن زیب تن کئے ہوئے۔ میں نے کال بیل بجائی یعنی کھانسا تو اس شخص نے آنکھ کھولی۔ میں نے پوچھا "جناب! کیا یہ آپ کا جدی مکان ہے؟"

وہ بولا "جی نہیں! میری اپنی دانائی کی تعمیر ہے۔"

میں نے کہا "دانائی نہیں، دلیری بھی۔ مگر منصوبہ تو ناجائز کالونی میں راتوں رات تعمیر کیا ہوا مکان معلوم ہوتا ہے۔ ناجائز مکان گرانے والے میونسپل اسکواڈ کو اگر علم ہو گیا تو وہ اسے گرا دے گا۔ کیونکہ اس کا نقشہ تم نے میونسپل کارپوریشن سے پاس بھی نہیں کرایا ہوگا۔"

وہ بولا "پاس کرا لیا ہے۔ میرے سونے سے پہلے ڈیوٹی کانسٹیبل نے مجھ سے پچاس پیسے لیئے اور نقشہ پاس کر دیا۔ آدمی اگر ذرا دانا ہو تو وہ آزاد سماج کو پچاس پیسے میں بھی خرید سکتا ہے۔ پچاس پیسے میں نقشہ پاس۔ شارٹ کٹ!

میں نے پھر سوچا مگر دیکھو باہر کپکپا دینے والی سردی ہے۔ کیا تمہیں اس نفیس لباس میں سردی نہیں لگتی؟"

اس نے شاید مسکرا کر (اندھیرا تھا مگر پھر بھی اس کی مسکراہٹ چمکی) جواب دیا۔ "ارے بابو جی! جسم پر ہڈیاں ہی ہڈیاں تو باقی رہ گئی ہیں اور ہڈیوں کو سردی کہاں لگتی ہے؟"

اور میں کہ سگریٹ آدھا پی چکا تھا۔ باقی آدھا سگریٹ اس نے مجھ سے خواہ مخواہ مانگ لیا جو میں نے بھی پیش کر دیا۔ میرے اندر بھی خواہ مخواہ انسانیت پیدا ہو گئی تھی ـــــ اور پھر جاتے جاتے میں نے اسے کہا کہ "تم رین بسیرا میں جا کر کیوں نہیں سوتے سرکار نے تمہارے ایسے دانا ؤں کے لئے تو بنا رکھے ہیں۔

وہ بولا ـ اجی وہاں بدبو اور غلاظت بہت ہے اور پھر کریشن اس

غلاظت سے بھی زیادہ ہے۔ مجھے وہاں چین کی نیند نہیں آتی۔

دوسرے دن صبح کے اخبار میں ایک سرکاری بیان پڑھا کہ دہلی میں بیس ہزار انسان ایسے ہیں جو سرد ٹھٹھرتی راتوں میں فٹ پاتھوں کے فرش پر سوتے ہیں۔ عام طور پر سرکاری بیان غلط ہوتے ہیں کیوں کہ انہیں سرکاری افسر تیار کرتے ہیں۔ وہ سرکاری پالیسی کے خلاف بیان تیار.....

.....کریں تو ان کی نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ساٹھ لاکھ کی آبادی کے شہر میں صرف بیس ہزار بے گھر ٹھٹھرنے والے۔ یہ تعداد تو انتہائی بے ضرر معلوم ہوتی ہے۔ بیس ہزار افراد سرد ہواؤں میں منجمد ہو کر فٹ پاتھوں پر مر بھی جائیں تو کیا ہرج ہے۔ وہ تین دنوں میں بیس ہزار اور آجائیں گے اور ساٹھ لاکھ کا شہر چلتا رہے گا۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ جو بیس ہزار مرے وہ کیوں مرے؟ اور مرنے کے بعد جو بیس ہزار نئے آگئے تو بھی ساٹھ لاکھ کے شہر کو کیا فرق پڑتا ہے۔ شہر میں فٹ پاتھ تو کئی ہیں۔ ہزاروں ہیں۔

فٹ پاتھ کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس پر پیدل چلنے والے چلا کریں۔ لیکن اس کے بعد ایک نہیں دو مقصد ہو گئے۔ دن کو پیدل چلنے والوں کے لیئے اور رات کو سردی سے ٹھٹھر کر سوتے سوتے مر جانے والوں کے لیئے ـــــ میں ان فٹ پاتھوں پر سے کئی بار گزرا ہوں اور دیکھا ہے کہ یہ دن میں اتنے آباد نہیں ہوتے جتنے رات کو ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بار ایک فٹ پاتھ سے گزر ہوا تو پورا فٹ پاتھ بے گھر سونے والوں کی جدی جائداد

بنا ہوا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان، بچے بلکہ کئی وہ بچے بھی جو ماں کی کوکھ سے ابھی ابھی نمودار ہوئے تھے، وہ نودارد تھے۔ پیدا ہوتے ہی ان پر سب سے پہلا انکشاف یہ ہوا کہ یہ فٹ پاتھ ہی پورا بھارت ورش ہے اور ہم بھارت ورش کے آزاد شہری کے طور پر پیدا ہوئے ہیں۔

اور اس بار میں نے ایک فٹ پاتھ باشی سے پوچھا۔ "تم دہلی کیوں آئے تھے۔؟"

وہ پیٹ پر ایک تھپڑ لگا کر بولا۔ "یہ پاپی پیٹ مجھے یہاں لایا ہے۔"

کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہمالیہ سے جب برفیلی سرد ہوائیں چلتی ہیں تو سیدھا فٹ پاتھوں کا رخ کرتی ہیں اور بے گھر کو مار دیتی ہیں۔

"اجی سرد ہوائیں تو اپنے گاؤں میں بھی آجاتی تھیں۔ لیکن وہاں ہمیں ہوا نہیں بلکہ بھوک مار دیتی تھی کم سے کم دہلی میں پیٹ کے اندر دو روٹیاں تو جھونک دیتا ہوں۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ دن بھر گھوم پھر کر غبارے اور تو تلیاں اور پلاسٹک کی عینکیں، اور مرلیاں بیچتا ہے اور رات کو اس فٹ پاتھ پر آکر سو جاتا ہے۔ بھگوان نے آسمان کی چھت اور زمین پر فرش ہمارے ایسوں کے لیے ہی بنائے ہیں اور جب میں نے پوچھا کہ تم جو کمبل اوڑھے سو رہے ہو۔ یہ کہاں سے حاصل کیا تو وہ بولا "ادھر اپنا ایک دادا بھائی ہے اس نے دیا ہے۔"

"دادا بھائی! مگر دادا تو غنڈے کو کہتے ہیں رے!"

اجی نہیں، وہ کہتا تھا۔ وہ کہتا تھا میں غنڈہ نہیں ہوں۔ ایک سماج وادی

"میں دفتر میں بیرے سے چائے منگوا کر پی لوں گی۔"

اور خاوند یعنی بیرا اپنے لئے خود چائے بناتا ہے۔ چینی کا ڈبہ باوجود تلاش کے نہیں ملتا، تو پھیکی چائے پی کر راضی ہو جاتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ چینی کے عدم استعمال سے شوگر کے جان لیوا مرض کا چانس کم ہو جائے گا۔

لیکن ہندوستان میں ایسی بیدار مغز عورتیں ابھی کافی اقلیت میں ہیں۔ ورنہ عورتوں کی اکثریت کو اب بھی ہندوستانی مرد "گھر کی رانی" کہتا ہے۔ کچھ یوں کہ حکومت تو مرد کرتا ہے، رانی اُسے کہتا ہے مگر رانی کی حیثیت بس اتنی ہے۔ جیسے برطانیہ کی ملکہ معظمہ کی یا ہندوستان کے راشٹرپتی کی ہوتی ہے۔ یعنی عورت گھر کی آئینی حکمران ہے۔ اور یہ آئینی حکمران ہر صبح اپنے خاوند سے پوچھتی ہے "حکم دیجئے کہ آج آپ بیگن کھانا پسند کریں گے۔ یا آلو بڑیاں بنا دوں!"

ایسی آئینی حکمرانی کو ہندوستان میں پتی برتا دھرم کہا جاتا ہے (عورتوں کی بیداری کی طرح پتی برتا دھرم بھی خاوندوں کی ایجاد ہے)

لیکن ہندوستان میں عورتوں کی ایک تیسری قسم بھی پائی جاتی۔ اور یہ قسم بیک وقت بیدار بھی ہے اور پتی برتا بھی۔ یعنی وہ ایک طرح کی ملی جلی بیوی ہے۔ بالکل مکسڈ اکانومی۔ ہندوستانی مردوں نے اپنی حد سے زیادہ ترقی کرنے کے لیے مکسڈ اکانومی بھی چلا رکھی ہے یعنی پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر۔ پبلک سیکٹر میں نااہلیت کے باعث عام طور گھاٹے پڑتے ہیں۔ اور یہ گھاٹا وہ پرائیویٹ سیکٹر سے پورا کرتے ہیں۔ ایک روپے کا گھاٹا ہو تو پرائیویٹ سیکٹر دو روپے کا ٹیکس لگا دیتے ہیں۔

ان تیسری قسم کی عورتوں کے بھی دو حلقے دو کام ہیں۔ ایک تو وہ دفتروں میں نوکری

پارٹی کا ورکر ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ کئی سیاسی پارٹیاں اپنے مینی فیسٹو کی حفاظت کے لیے اکثر کئی غنڈے رکھ لیتی ہیں۔ آج کل غنڈے اور ورکر میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا "تو پھر دادا بھائی ورکر نے کیا کہہ کر کمبل عنایت کیا۔؟"

وہ کمبخت مسکرایا۔ "اجی کیا آپ نہیں جانتے کہ الیکشن آنے والے ہیں۔ اس لیے دادا کی پارٹی نے سب بے گھر، بے در، غریب غربا کے لیے ایک ہزار کمبل مفت بانٹنے کا پروگرام بنایا ہے۔ الیکشن نزدیک ہو تو ایسے پروگرام بنانا ہی پڑتے ہیں۔"

میں نے سخت ترین لہجہ میں کہا "ارے تم اتنا تیز سچ کیوں بول رہے ہو۔"

وہ بولا "کیا کروں جی! سچ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"دہلی میں آئے ہو تو یہ عادت ترک کرنا پڑے گی۔ جھوٹ بولو کرو جھوٹ! سمجھے؟ اچھا تو ایک جھوٹ بول کر دکھاؤ۔؟"

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "اجی! ایک جھوٹ یہ ہے کہ آپ جیسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ فلاں پارٹی نے مجھے مفت کمبل دیا ہے۔ مگر نہیں دادا نے ہم میں سے ہر ایک سے دو دو روپے لیے ہیں تاکہ ہمالیہ کی سرد ہواؤں سے بچائے رکھے یہ کمبل — اوپر عرش نیچے فرش اور بیچ میں دو دو روپے قہ قہ قہ قہ۔"

ہاں میں ہاں ملانا

ایک زمانہ تھا جب ہاں میں ہاں ملانے کو خوشامد سمجھا جاتا تھا۔ آج کل اسے "فائن آرٹ" سمجھا جاتا ہے، زمانہ بدلتا ہے تو الفاظ کا مفہوم بھی بدلتا ہے۔ اب یہ کوئی بڑا مفکر ہی بتا سکتا ہے کہ زمانہ پہلے بدلتا ہے یا مفہوم پہلے بدلتا ہے یا دونوں ایک ساتھ بدلتے ہیں۔ اور دونوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بدل گئے ہیں۔

میرے گھر میں ایک صندوق ہے جسے میری بیوی جہیز میں لائی تھی۔ انجر پنجر صندوق کے بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں اور میری بیوی کے بھی۔ کبھی کبھی میری بیوی مجھے یہ اطلاع فراہم کرتی ہے۔ "آپ جانتے ہیں، یہ صندوق میرے والد صاحب نے خاص طور پر جاپان سے منگوایا تھا میرے لیے۔

میں ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ "جانتا کیوں نہیں۔ اس صندوق پر چالیس

سال بعد بھی صاف پڑھا جاتا ہے۔ "میڈ اِن جاپان"۔

یہ سُن کر میری بیوی اتنی خوش ہو جاتی ہے کہ خالص دیسی گھی کے پراٹھے کھلا دیتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کسی چیف منسٹر سے کہیں کہ آپ تو وزیر اعظم بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ خوش ہو کر آپ کو سمنٹ کا بہت بڑا پرمٹ دلا دے، جسے آپ بلیک میں اتنی آسانی سے بیچ سکتے ہیں جیسے کوئی چپڑاسی بڑی آسانی سے دو روپے رشوت لے لیتا ہے اور صاحب کے کمرے کے اندر جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔

ہاں مجھے بیوی نے پراٹھے کھلائے حالانکہ اس کے والد نے یہ صندوق سیکنڈ ہینڈ خریدا تھا اور پڑوسی رام پرشاد سے آدھے داموں پر لے کر پالش وغیرہ سے چمکا دیا تھا۔ بلکہ اس پر میڈ اِن جاپان بھی لکھوا دیا تھا جیسے آج کل کئی ڈپلیکیٹ اشیاء پر کمپنیوں کا نام گندہ کر دیا جاتا ہے اور نہ صرف بڑی کمپنی کچھ نہیں کر سکتی بلکہ سرکار بھی کچھ نہیں کر سکتی کچھ نہ کرنے کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بڑی کمپنیاں اور سرکار ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

میری بیوی بھی میرے لیے سرکار ہے کیونکہ وہ گھر کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہے۔ میں ماتحت اور وہ افسر۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں تو کئی آفتوں سے بچا رہتا ہوں۔ ہاں میں ہاں ملاؤں تو پراٹھے ملتے ہیں نہ ملاؤں تو گالیاں ملتی ہیں اور شرفا میں گالی دینے کا نہیں گالی کھانے کا رواج ہے۔

ایک لطیفہ جو بیک وقت باسی اور تازہ ہے سُن لیجیے۔ کہ ایک افسر نے ماتحت سے کہا "پرسرام آج تو موسم بہت خوشگوار ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل

رہی ہے۔

حالانکہ اس وقت جھلسا دینے والا جھکڑ چل رہا تھا۔ مگر ماتحت نے کہا۔

"ہاں جناب! اتنا خوشگوار کہ ہمارا شہر آج بالکل ہل سٹیشن لگ رہا ہے۔"

چار پانچ منٹ بعد وہ افسر اپنے ماتحت سے بولا۔ "پرسرام یہ کھڑکیاں بند کردو۔ اندر تو آگ برساتی ہوئی لُو آرہی ہے۔

ملازم نے جواب دیا۔ "جناب! میں تو پہلے ہی عرض کرنے والا تھا کہ کھڑکیاں بند کردیں۔ نجانے کیسا ظالم موسم آگیا ہے۔"

افسر نے کہا۔ "ارے! پانچ منٹ پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ موسم بڑا خوشگوار ہے۔ اب کہہ رہے ہو ظالم ہے۔"

پرسرام نے جواب دیا۔ جناب میں آپ کا نوکر ہوں موسم کا نہیں"

ایسا ہی جو ماتحت اپنے افسر کی ہاں میں ہاں ملائے۔ وہ اپنے آپ کو ہوشیار، ذہین، دوراندیش بلکہ افسر سے بھی زیادہ دانشمند سمجھتا ہے۔ میں ایسے ہی ایک ماتحت کو جانتا ہوں جس نے ہاں میں ہاں ملانے کے سبھی ریکارڈ توڑ دیئے تھے بلکہ فخر سے کہتا تھا کہ میں نے ایک بار اپنے باپ کا بھی ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

چنانچہ گزشتہ دنوں ان سے ملاقات ہوئی ایک چمکیلی کار میں سوار تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کار کس کی ہے بھائی؟"

"میری اپنی ہے۔ اب افسر ہوگیا ہوں نا"

"کونسی افسری ملی ہے؟"

"اس افسری کی کرسی جس کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ ادھر وہ ریٹائر ہوئے ادھر مجھے اس کرسی پر بیٹھا دیا گیا۔"

افسر کی کرسی پر تین قسم کے آدمیوں کی نگاہ ہوتی ہے۔ ایک وہ جو افسر کے ریٹائر ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے ایک وہ جو انتظار کرنے والے کے ریٹائر ہونے کا انتظار کرتا رہتا ہے وہ تو کچھ جیب تشیوں سے بھی کنسلٹ Consult کرتا رہتا ہے کہ اس افسر کی صحت کب خراب ہوگی۔ اور وقت سے پہلے کب ریٹائر ہو جائے گا۔ اور تیسرا وہ جو ریٹائرمنٹ کے چکر میں نہیں پڑتا۔ بلکہ ہاں میں ہاں ملانے کا گر جانتا ہے۔ افسر سے لے کر وزیر تک کی۔ یہ گر کئی بار بڑے بڑے معجزے دکھاتا ہے۔ میرے ایسے ہی ایک واقف کار ہیں صرف پانچ برس تک ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ ایک دن لے تو گئے لگے۔ "ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں۔"

"کیا کسی کلچرل ڈیلیگیشن میں؟"

"نہیں یہاں کی نوکری چھوڑ دی۔ افسر مہربان تھا اس نے ایک پرائیویٹ فرم سے میرا ٹانکا جوڑ دیا۔ اب جرمنی میں جا کر فرم کا کام کروں گا۔ یہاں سے دس گنا زیادہ تنخواہ ملے گی۔"

میں مسکرا دیا تم جہاں ہیں ہاں ملانے کی جس صلاحیت کے مالک ہو اس نے تو واقعی جادو کر دکھایا ہے۔"

وہ بولے۔ "ہاں۔ مثلاً آپ اپنا کیس لیجئے۔ آپ نے جتنی تحریریں لکھیں۔ میں نے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔"

میرا جواب تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ آپ میری کئی گھٹیا تحریروں سے بھی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ لیکن کیا میں نے آپ سے اختلاف ظاہر کیا؟"

" جانتے ہیں آپ۔ اسے کیا کہتے ہیں؟"

" انسانیت......"

لیکن انسانیت کبھی کبھی الٹے پاؤں بھی چلنے لگتی ہے۔ ایک بار ایک افسر کا ماتحت ایک لایا۔ افسر سے پوچھا:

" صاحب کتاب کیسی ہے؟"

" نہایت گھٹیا اور پوچ ہے"

ماتحت بولا " جناب میری شاعری کا مجموعہ ہے"

افسر بولا۔" میرا مطلب ہے شاعری تو اعلیٰ ہے کتابت گھٹیا ہے"

" کتابت میں نے خود کی ہے۔"

اوہو۔ آپ سمجھے نہیں۔ میرا مطلب تھا۔ جس پریس میں چھاپی گئی ہے وہ گھٹیا تھا مگر یہ بتائیے۔ آپ نے کبھی اپنی شاعری پہلے کیوں نہیں شائع کی؟"

ماتحت ہنس کر بولا " جناب! میں ایسا رسک کیوں لیتا ہے میں تو صرف آپ سے ہی اپنی غزلیں سناتا ہوں۔ جو میری ہاں میں ہاں ملا دیتا ہے۔"

ایک ناخوشگوار مکالمہ

"آپ گنجے کیوں ہو گئے۔ کیا آپ کے ماں باپ گنجے تھے؟"

"نہیں۔ میرے ماں باپ کے ماں باپ گنجے تھے۔"

"تو پھر آپ کے ماں باپ گنجے کیوں نہ ہوئے؟"

"کیونکہ ان کے زمانے میں گنجگی کا ٹریفک بری طرح رک گیا تھا۔ تواریخ عالم میں کئی بار ایسا ہوا ہے۔"

"لیکن کل میں نے دیکھا کہ خلیجی ممالک کے ایک ہندوستانی سوداگر کے ساتھ کھڑے آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے چہرے پر ایمان و صداقت کا نور جھلک رہا تھا۔"

"نہیں۔ وہ نور دس ہزار روپے کے اس چیک کا تھا جو بوقت نماز میری جیب میں تھا۔"

"اُس چیک نے آپ کی جیب میں پناہ کیوں لے رکھی تھی؟"

"کل رات ایک فائیو سٹار ہوٹل میں دو ارب پتی سوداگر اور میں وہسکی پی رہے تھے تو سوداگر نے میری جیب میں وہ چیک ڈال کر کہا تھا۔ آپ ملک بھر میں میرا پراپیگنڈہ کریں کہ میں پانچ وقت کا نمازی ہوں۔ اور خدا اور رسول کے ارشاداتِ عالیہ پر مکمل یقین رکھتا ہوں۔"

"آپ اس دس ہزار روپے کے چیک سے کیا سلوک کریں گے؟"

"ہم دام پرستی پبلسٹی۔ جناب! آج کل لوگ پیسے کو سجدہ کرتے ہیں خدا کو نہیں۔"

"کیا آپ نے زندگی میں کوئی نیک اور معقول کام بھی کیا ہے؟"

"جی تو بہت چاہتا ہے۔ مگر فرصت نہیں ملتی۔ البتہ پچھلے ہفتے میں ایک کال گرل کی سپلائی کرنے جا رہا تھا تو ایک اندھے بھکاری کو ایک ڈانگ خرید کر دے دی۔ تو اُس نے مجھے دعا دی کہ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

"تو کیا اجر مل گیا؟"

"ہاں، اُس کال گرل کے گاہک سے مجھے توقع سے ڈیڑھ گنا زیادہ کرایہ مل گیا اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ نیک کاموں کا اجر ضرور ملتا ہے۔ اسی لیے انتہائی مصروفیت میں سے بھی چند لمحے نیکی کے لیے ضرور نکال لیتا ہوں۔"

"مگر مجھے لگتا ہے، کہ آپ کے اندر شیطان بیٹھا ہے۔ جو آپ کو اجر دلواتا رہتا ہے۔"

"ممکن ہے وہ اندھا بھکاری شیطان ہو۔ لیکن جناب! شیطان بھی ایک بہت

بڑی طاقت ہے جو خدا تک کو متحرک رکھتا ہے۔"

"آپ خدا سے ڈرتے ہیں یا شیطان سے؟"

"جناب! میں تو دونوں کا غلام ہوں۔"

"مگر دونوں کی غلامی ڈپلومیسی ہے۔ بلکہ مکاری ہے۔"

"اجی، انسان کا کام ہونا چاہیئے۔ نام کوئی بھی رکھ لیجئے۔ ڈپلومیسی یا مکاری۔ کیونکہ میں تو گیتائی کرم فلاسفی میں یقین رکھتا ہوں۔"

"آپ نماز بھی پڑھتے ہیں اور گیتا پاٹھ بھی کرتے ہیں۔ آخر یہ ڈبل کردار کیا ہے؟"

"یہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔"

"اگر آپ میری نیت پر شک نہ کریں تو ذرا یہ بتا دیجئے کہ آپ کا اسم شریف؟"

"رام غلام سنگھ۔"

"خالص سیکولر نام ہے۔ کیا کال گرلز سپلائی کرنا بھی سیکولر کام ہے؟"

"سو فیصدی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ـــــ میں سبھوں کو کال گرلز سپلائی کرتا ہوں۔ میں اپنے دھندے کے لیئے گھٹیا فرقہ پرستی میں یقین نہیں رکھتا ہوں۔"

"کیا آپ شاعری میں بھی یقین رکھتے ہیں؟"

"یقین! اجی، میں تو خود شاعر ہوں۔ مثلاً فلسطینی مجاہد جس جگر کاری سے اسرائیلی جابروں سے جنگ آزما ہیں۔ اُن پر میں نے ایک زبردست نظم لکھی ہے جس کے دو مصرعے سُن لیجئے۔

ریت سے دودھ ٹپک پڑا ہے
بگولوں کے پستانوں سے

" لیکن یہ نظم تو ایک اور شاعر نے قلم بند کی ہے۔ میں نے خود ان کے منہ سے سُنی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ انتہائی دروغ گو ہیں۔؟"

" مگر اس کا مطلب یہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ جس شاعر سے آپ نے سُنی وہ دروغ گو ہو اور یہ لیجیے، ایک ہزار روپے کے کرنسی نوٹ، اور بتائیے کون دروغ گو ہے؟ میں کہ وہ؟"

" نہ آپ نہ وہ۔ بلکہ دروغ گو تو یہ کرنسی نوٹ ہیں۔ کیا آپ کے تعلقات کسی وزیر یا وزیر زادے سے بھی ہیں۔؟"

" اس کا جواب تو کوئی کال گرل ہی دے سکتی ہے۔ جو چشم دید گواہ ہوتی ہے کیا یہ کرنسی نوٹ پھر اپنی جیب میں رکھ لوں؟"

" نہیں کسی ندھوام آشرم کو دے دیجیے۔"

" میں تو ایک ودھوا آشرم کو باقاعدہ ماہانہ دیتا ہوں بلکہ اُس آشرم کا پریذیڈنٹ ہوں۔"

" جیسے آپ نے ایک اندھے کو ایک لاٹھی بطور امداد دی تھی۔ لگتا ہے آپ کی پریذیڈنسی بھی ودھوا آشرم کے لیے ایک ڈنڈا ہے۔ بتلائیے ہے کہ نہیں؟"

" آپ اُسے ڈنڈے کا نام دیجیے یا کچھ اور لیکن میں نے عرض کیا تھا نا ؟ میں کام میں یقین رکھتا ہوں نام میں نہیں۔"

" اگر کوئی نوجوان اور حسین ندھوا لڑکی، رات کو آپ کے بستر میں گھس آئے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

کرنے کے لیے بنی جاتی ہیں۔ کیونکہ مرد اسے کہتا ہے، تم نوکری نہیں کروگی، تو گھر میں ایک وقت کا کھانا پک سکتا ہے، دوسرے وقت گھر بھر بھوکا ــــ تمہاری بیداری کا مطلب یہ نہیں تھا۔ کہ گھر بھر کو بھوکا رکھو۔"

چنانچہ گھر مکسڈ اکانومی سے چلتا ہے۔ بیوی صبح مندرجہ ذیل کام کرتی ہے۔

۱۔ "روتے ہوئے بچوں کو تھپڑ مارنا اور پھر چپ کرانا۔ (مرد اخبار پڑھتا رہتا ہے۔)

۲۔ سبزی چھیلنا، آٹا گوندھنا۔ کھانا پکانا۔ (مرد شیو کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

۳۔ بچوں کو اسکول جانے کے لیے تیار کرنا، اور گالیاں دینا، خاوند کو نہیں، بچوں کو۔ بلکہ بچوں کی آڑ میں دراصل خاوند کو (خاوند غسل خانے میں جاکر گنگنا رہا ہوتا ہے)

۴۔ بیوی غسلخانے میں اتنی جلدی جلدی نہاتی ہے۔ جیسے متوقع خطرے کے پیش نظر کوئی جلدی جلدی دو چار گائتری منتر بول دیتا ہے (خاوند اپنی نکٹائی اور پینٹ فٹ کر رہا ہوتا ہے)

اور جب شام کو دفتر سے بیدار مغز عورت، ایک وقت کی روٹی کما کر گھر لوٹتی ہے۔ تو پھر وہی جھاڑ پہار، کچن، بچے بلکہ اپنے نالائق باپ کے نالائق بچے کو بھی درک بھی خود کر کے دیتی ہے۔ اور جب خاوند لوٹتا ہے تو وہ ڈنر کھانے کے بعد اپنی پتی برتا استری سے زیادہ یہ کہتا ہے، "چلو، آج ہم ایک فلم دیکھ کر آئیں۔ دونوں مل کر، کیونکہ آخر ہم جیون ساتھی ہیں۔

اور بیوی کہتی ہے "نہیں میں تھک گئی ہوں۔ فلم دیکھنا ہے تو اپنی گرل فرینڈ

"یہ تو عمل میری بیوی سے پوچھیئے۔ جو ہر رات داشگاف ہو کر میرے بستر میں گھس آتی ہے۔"

"نہیں، میں نے صد فی صدی کا ذکر کیا تھا۔ کیا آپ کی بیوی صد فی صد ہوا ہے؟"

"ہاں، ساڑھے ننانوے فی صدی۔ کیونکہ وہ مجھے اپنا چوتھا خاوند سمجھتی ہے۔ مگر میں نے ابھی تک اس سے شادی نہیں کی۔ صرف وعدہ کیا ہے۔"

"گویا اس وعدے کو بھی آپ آدھا فیصدی مانتے ہیں۔ سچ مچ آپ بیحد کمینے ہیں۔"

"مگر جناب والا، حاضر میں جو کمینہ نہیں، وہ تو آدھا فیصدی انسان بھی نہیں۔ قہ قہ قہ!"

نو بچّوں کا باپ

"مبارک ہو جناب! کہ آپ نو بچّوں کے باپ ہیں۔" میں نے اس سے پوچھا۔ نو بچّوں کے باوجود اس کے سر کے ابھی آدھے ہی بال اُجڑے تھے۔ باقی آدھے بال ابھی نجانے کتنے مزید آنے والے بچّوں کے لیئے صحیح سلامت تھے۔

اس نے انکساری میں سر ہلایا۔ اور آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھا کر بولا۔ "جی، یہ سب اللہ کی برکت ہے۔"

مجھے یوں لگا "اللہ" فیملی پلاننگ کا شدید ترین دشمن ہے۔

میں نے پوچھا۔ "قبلہ! آپ کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں؟"

"سولہ سترہ گھنٹے تو کر ہی لیتا ہوں۔"

میں نے سوچا یہ بھی اللہ کی ایک اور برکت ہے۔ نو بچّوں کی خوراک

اور لباس کے لیے سولہ سترہ گھنٹے کام تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ گورنمنٹ کی یہ حماقت ہے، کہ کام کے صرف آٹھ گھنٹے مقرر کر رکھے ہیں۔ آٹھ گھنٹے کے کام میں تو اس کے ساڑھے چار بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ اللہ سولہ گھنٹے کام کرواتا ہے سرکار آٹھ گھنٹے۔ اسی لیے تو اللہ عظیم۔ سرکار ناقص ہے۔

میں نے اس کی پیٹھ پر تحسین کی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "جناب! اگر آپ برا نہ مانیں، تو کیا آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے نورتن کون ہیں، کیسے ہیں، ان کا کیا کردار ہے، ان کی مصروفیات کیا ہیں؟"

وہ بے تکلفی سے بولا۔ "۳ بیٹے، ۲ بیٹیاں، سبھی ایک کمرے میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "ہاں، برا آپ کیوں مانیں گے۔ برا تو وہ نو بچے مانیں گے جو ایک کمرے کے جہنم کو جنت سمجھ کر رہتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے ہر بچے کی جو تفصیل بتائی وہ قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ غمگین یا مسرور ہونا قارئین کا کام ہے، میرا کام نہیں۔

پہلا بچہ ——

یہ میرا سب سے پہلا بیٹا ہے۔ شادی کے بعد ایک سال کے اندر اندر اگر بچہ پیدا نہ ہو تو برادری میں کھسر پھسر ہونے لگتی ہے کہ یا تو ماں میں نقص ہے یا باپ میں۔ چنانچہ میرا پہلا بیٹا اسی کھسر پھسر کی پیداوار ہے۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ وہ ماں پر گیا ہے۔ ایک روپے کی چیز خریدنے کے لیے مارکیٹ میں بھیجو۔ تو پچیس پیسے اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے، اعتراض کرو تو ماں کی

طرح دھما چوکڑی - سکول میں آٹھ جماعتیں پڑھا - ہر جماعت میں ایک ایک سال فیل ہوتا رہا - تو بمبئی میں فلم کا ہیرو بننے کے لیے بھاگ گیا - وہاں چند سال ایک فلم کمپنی میں چپڑاسی کا کام کرتا رہا - میں اُسے بمشکل واپس لایا - اور ایک ٹیلی ویژن مکینک کے یہاں آج کل ٹریننگ کر رہا ہے - ہر ایک پروفیشن جماتا ہے، شترو گھن سنہا نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں انہیں شترو گھن سنہا بنا دوں گا - میرا خیال ہے کہ جب بائیس برس کا ہو جائے گا، تو یہ شترو گھن سنہا ٹی وی مکینک بن کر کافی پیسے کمانا شروع کر دے گا -

دُوسرا بچہ ——

اس بچے کو بطور دختر پیدا ہونا چاہیئے تھا کیونکہ میری بیوی کے مرشد نے یقین دلایا تھا (یقین کامل کی قیمت ایک سو ایک روپیہ تھی) لیکن دختر کے بجائے بیٹا پیدا ہو گیا - مرشد نالائق نکلا - بیوی بے وقوف نکلی - یہ بیٹا سیدھا سادا اور شریف ہے میری طرح ساتویں جماعتوں سے آگے اس لئے نہیں بڑھ سکا کیونکہ تعلیم کو ہم ضرر رساں سمجھتے ہیں - چنانچہ ایک ڈرائیور سے اس کی دوستی کروا دی - جو اُسے ڈرائیوری بھی سکھاتا ہے اور چوری بھی - دیکھیں دونوں میں کو نسے فن میں طاق ہو کر نکلتا ہے -

تیسرا بچہ ——

یہ میری پہلی بیٹی ہے - بقول میری بیوی کے اسی طرح کی حسین و دلکش - میونسپل پرائمری اسکول میں داخل کرایا - پانچویں جماعت تک صرف ایک سو تک گنتی سیکھ سکی - سوچا، حسین ہونا گنتی کے لئے موزوں نہیں - اور پھر لڑکی ہے ہر وقت

اخلاق کا خطرہ۔ تیرہ برس میں ہی اس کے لیے کوئی معقول خاوند تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی تک معقول تو ایک طرف خاوند تک نہ مل سکا۔ اللہ کے بھروسہ قد اور حسن میں برابر ترقی کر رہی ہے۔

چوتھا بچہ ——

یہ بھی بیٹی ہے، نقش و نگار کی شوقین ہے اس لیے مسلسل گالیاں کھاتی رہتی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ چوری چھپے ایک فلم بھی دیکھ آئی۔ جس سے شرنگار اور گالیاں دونوں کی رفتار بڑھ گئی۔ پڑھایا اس لیے نہیں کیونکہ بڑی بیٹی کا حشر دیکھ چکے تھے۔ اس کی ماں اسے سگھڑ بنانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہے میں بیوی سے کہتا ہوں، شادی کے بعد اس میں سگھڑاپا آجائے گا۔ تم بھی تو شادی کے بعد سگھڑ بنی تھیں۔ پہلے تو صرف الھڑ الھڑ ہی تھیں، مگر بیوی نہیں مانتی۔ نہیں مانے میری بلا سے۔

پانچواں بچہ ——

یہ بھی تیسری بیٹی ہے جو اس زمانے میں پیدا ہوئی جب فیملی پلاننگ والے بچے نہ پیدا کرنے پر پاسپتی گھی کا ڈبہ بطور تحفہ دیا کرتے تھے۔ اب سوچتا ہوں، یہ بیٹی پاسپتی گھی کے ڈبے کی کوالٹی سے بہتر ہے۔ بیوی مجھ سے اتفاق نہیں کرتی۔ یہ بیٹی چوتھی جماعت میں پڑھتی ہے، کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتی ہے۔ کہتی ہے کہ میں لیڈی ڈاکٹر بنوں گی۔ مگر میں اسے آٹھویں جماعت سے زیادہ نہیں پڑھنے دوں گا۔ کنبے کا خرچہ بڑھ گیا ہے، اس لیے ہمارے لیے لیڈی ڈاکٹر پیدا کرنے کا کوئی چانس نہیں۔

چھٹا بچہ ——

یہ برخوردار ایک بیٹا ہے۔ قریب قریب منحوس ہے، آٹھ نو سال کا ہے مگر گھر بھر میں سب سے زیادہ پیٹو ہے۔ سب بہن بھائیوں سے لڑ جھگڑ کر خوراک کا رُخ ہمیشہ اپنے ہی پیٹ کی طرف کر لیتا ہے۔ دن بھر گلی ڈنڈا اور فٹ بال وغیرہ کھیلتا رہتا ہے۔ پڑھا بالکل نہیں مگر دنیا کی ہر چیز جانتا ہے۔ ایک ہوٹل میں جھوٹے برتن مانجتا ہے تنخواہ ہمیں نہیں دیتا، خود کھا جاتا ہے۔ بالکل میرے ماموں پر گیا ہے جو جائیدادوں کے ناجائز سودے کیا کرتے تھے۔

ساتواں بچہ ——

پھر ایک بیٹی، ڈیل ڈول باپ جیسا۔ محنت کش بھی میری طرح، گھر کے اکثر کام کاج کرتی ہے۔ میری بیوی کا خیال ہے کہ میں اسے اپنے بھائی کے بیٹے کے ساتھ زندگی بھر کے لیے باندھ دوں گی۔ اس کے بھائی کا بیٹا ایک جواری کے بیٹے کا دوست ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری اس بیٹی کا مستقبل شاندار رہے، کیونکہ اس سوسائٹی کا پورا مستقبل جوئے بازی کی طرف جا رہا ہے۔

آٹھواں بچہ ——

یہ بیٹی دو برس پہلے پیدا ہوئی۔ چونکہ فیملی پلاننگ کی تحریک شریفانہ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کا پیدا ہونا غیر قانونی نہیں تھا۔ بڑی ہو کر کیسی بنے گی اللہ جانے، یا سرکار —— جوں جوں ملک کو مہذب بنانے پر تلی ہوئی ہے تو لاتوں سوسائٹی کرپٹ ہوتی جا رہی ہے۔

نواں بچہ ——

ابھی ساڑھے تین مہینے کی بیٹی ہے ۔ اگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کا محاورہ ٹھیک ہے تو کل اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں ماں کے کان کی سنہری بالی پکڑ لی، احتجاجی نسل کی کیونکہ ماں کے تھن کا دودھ جو سوکھ چکا ہے ۔ بازار سے دودھ لائے جب وہ بالی چھوڑے ۔ خطرہ ہے ۔ بڑی ہو کر نکسلائٹ بن جائے گی۔

برہمن سے ہریجن تک

میرے ایک دوست ہیں نریندر شرما۔ چونکہ برہمن فیملی میں پیدا ہو گئے۔ اس لیے بیچارے برہمن مانے جاتے ہیں۔ منو جی مہاراج نے کہا تھا۔ اے برہمن تیرا کام ہے لوگوں کو تعلیم دینا۔ مگر نریندر شرما تعلیم نہیں دیتے۔ ربڑ کی فیکٹری چلاتے ہیں۔ منو سمرتی ان کی ایک الماری میں پڑی ہے۔ جس کے کئی صفحے جھینگر کھا چکے ہیں۔ برہمن زادے نے اپنا رول بدل لیا۔ جھینگروں نے نہیں بدلا۔

چند دن پہلے وہ مجھے ریلوے سٹیشن پر مل گئے۔ ربڑ کے مال کی بکنگ کے لیے بکنگ کلرک کو رشوت دے رہے تھے (رشوت کے متعلق منو مہاراج کی معلومات اتنی بہتر نہیں تھیں) مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ مجھ سے محبت بھرا ہاتھ ملایا۔ بقول ان کے محبت

میں خلوص بھی شامل تھا۔ بولے " یار پہلے ایک شعر سن لو ؎

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام اب یعنی
ہمارے دوستوں کے بیوفا ہونے کا وقت آیا

میں نے کہا شعر اچھا ہے۔ کسی دوست کو شرمندہ کرنے کے لیے تیر بہدف ہے۔ اب آگے فرمایئے۔

کہنے لگے " ارے بھائی، میرا ایک پوتا ہے۔ اب چار برس کا ہو گیا ہے۔ اسے کسی سکول میں تعلیم کے لیے داخل کرا دو۔ میں تو ہر سکول میں بھاگ دوڑ کر ہار گیا۔ کہیں داخلہ ہی نہیں ملتا۔

یہ کہہ کر انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ نجانے وہ ریلوے کلرک کو رشوت دیتے وقت کیوں ٹھنڈا سانس نہیں بھرتا۔ میں نے حیرانی سے سوچا کہ برہمن بچے کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے سکول نہیں جبکہ اسے بڑا ہو کر سماج کو تعلیم دینی ہے (چاہے رشوت کی تعلیم ہی سہی) میں نے پوچھا۔ " نریندر جی۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ یہ ڈیوٹی اپنے بیٹے کو دیدو کہ تمہارا پوتا ہے تو اس کا بیٹا ہے۔

ایک اور ٹھنڈی سانس " میرا بیٹا نالائق ہے "

تو آپ نے ایسا نالائق بیٹا کیوں پیدا کیا؟

کیا کروں ننھال پر گیا ہے "

میں نے نالائقی کی لمبی تاریخ میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور پوچھا۔ " آپ کونسے سکول میں بچے کو داخل کرانا چاہتے ہیں؟

"کوئی ماڈل سکول ہو۔ جس کا میڈیم انگلش زبان ہو۔"

اور میں نے انھیں یہ کہہ کر بھی شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا کہ ہماری راشٹر بھاشا ہندی ہے۔ مگر آپ برہمن زادے ہو کر بھی 'راک اینڈ رول' کے کلچر کو بھارتیہ کلچر بنانے پر تلے ہوئے ہیں کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ انگریز کے بھاگ جانے پر انگریزی زبان زیادہ مقبول ہو گئی ہے اور انگلش میڈیم سکولوں میں صرف وہی بچے بھرتی کیے جاتے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد حکومت کا کاروبار سنبھالنا ہو اور ادھر گورنمنٹ سکولوں میں خاص طور پر ہندی ٹیچر بھرتی کیے جاتے ہیں۔ جو انگریزی ٹیچر ہونے کے باوجود انگریزی نہ جانتے ہوں کیونکہ گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ سرکاری سکولوں کے بچے بڑے ہو کر صرف ووٹ دینے کے لیئے ہی ریزرو ہوں حکومت کرنے کے لیے نہیں۔

لگتا تھا نریندر شرما بھی اپنے پوتے کو حاکم بنانا چاہتا تھا۔ ہماری مڈل کلاس کی ہمیشہ یہی ٹریجڈی رہی ہے کہ وہ حاکم بننا چاہتی ہے، بن نہیں پاتی۔ ووٹ دینا نہیں چاہتی مگر دیتی ہے۔

ماڈل سکول کے ایک پرنسپل میرے دوست تھے۔ دوست کیا تھے میری تحریروں کے مداح تھے۔ مداح کو دوست سمجھنا پرلے درجے کی غلط فہمی ہے۔ بہرکیف میں نریندر شرما کو لے کر ان سے ملا انھوں نے بزعم خود بڑی عقیدت دکھائی یعنی کمپا کولا کی دو بوتلیں پلائیں۔ میں نے اپنا مدعا ظاہر کیا کہ شرما جی کا پوتا کنڈرگارڈن میں داخل ہونا چاہتا

کے ساتھ چلے جاؤ۔ خاوند ایسے غصّے کو زہر اور شہد دونوں سمجھ کر پی جاتا ہے۔ اور کہتا ہے "معلوم ہوتا ہے، تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے، کیو تو دبا دوں؟"

"نہیں، سر تو بیویاں دبایا کرتی ہیں۔ آپ مجھے اسپرو کی ایک ٹکیہ لا دیں۔"

خاوند اسپرو کی ٹکیہ لا دیتا ہے۔ اور بیوی کھا کر یہ سوچتے سوچتے سو جاتی ہے۔ کہ یہ اسپرو نہیں ہے بلکہ میرا خاوند ہے جو میرا سر دبا رہا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہر ہندوستانی کو یہ یقین دلایا گیا ہے۔ کہ ہندوستان دیہات میں رہتا ہے اسی طرح ہندوستانی عورت بھی دیہات میں زیادہ رہتی ہے۔ وہاں وہ بھینس کو جنگل میں چرانے بھی جاتی ہے۔ کیونکہ بھینس کو یقین ہے کہ وہ میری منہ بولی بہن ہے۔ یہ بہن اپنی بھینس کے لیے کھیت سے چارے کا گٹھا کاٹ کر، سر پر اٹھا کر گھر لاتی ہے، اناج پھٹکتی اور چھانٹتی ہے۔ بھینس کا دودھ دوہتی ہے۔ اس میں پانی خود نہیں ملاتی، خاوند ملاتا ہے۔ کیونکہ کچھ مختصر مردوں کو بھی کرنا پڑتی ہے۔ روس میں سوشلزم آنے سے پہلے ہی ہندوستانی دیہات میں ڈویژن آف لیبر کا نظریہ موجود تھا۔ آدھا بلکہ آدھے سے زیادہ کام عورت کرتی ہے آدھے سے زیادہ کام میں بچے پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ خاوند کا کام صرف بچوں کو گالیاں دینا، ڈنڈے مارنا وغیرہ ہوتا ہے۔ اور جو دیہاتی بچہ اپنے باپ کو جوابی ڈنڈا عرض فرما دے۔ اُسے باپ شیر کا بچہ کہتا ہے۔

اور کبھی کبھی یہ شیر کا بچہ گاؤں سے بھاگ کر شہر میں آجاتا ہے اور کسی گھٹیا ریسٹورنٹ میں جھوٹے برتن مانجتا ہے۔ بلکہ شہر کے ایک گھر میں تو میں نے دیکھا۔ تامل ناڈ سے آیا ہوا ایک مرد جھوٹے برتن مانجتا تھا، اور اس کی بیوی شہر کے بڑے بازار میں غبارے

ہے، کر لیجئے۔ میں اور مسز مہاراج دونوں خوش ہوں گے کیونکہ ایڈوانس بہت زیادہ ہے۔

وہ بے ساختہ مسکراہٹ (جس میں نوے فیصد تصنع تھا) کے ساتھ بولے "سوری! آپ لیٹ ہو گئے۔ ہمیں پچاس بچے لینا تھے۔ جبکہ ایک ہزار نو سو اٹھانوے بچوں کے رجسٹریشن فارم آچکے تھے۔"

میں نے کہا "آپ تو میرے مہاراج ہیں"

وہ بولے "ایک وزیر کا سیکرٹری بھی میرا مہاراج تھا لیکن اس کا بچہ ٹیسٹ میں فیل ہو گیا۔ کیا ان کے بچے کو کچھ انگریزی آتی ہے؟"

میں نے کہا "انگریزی سیکھنے کے لیے تو آپ کے سکول میں لائے ہیں۔ ورنہ گھر میں تو مادری زبان ہندی بولتا ہے۔ چند گھریلو کرمچاریوں سے سن کر کچھ گالیاں بھی سیکھ گیا ہے۔"

اس نے ایسی تیکھی مسکراہٹ سے ہمارے مسئلے کا جواب دیا کہ جب ہم اس کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو یوں لگتا تھا کہ کمپاؤنڈ ہمارے پیٹ میں ہمیں گالیاں دے رہا ہے۔

اور پھر اس کے بعد دوسرا ماڈل سکول؟ جہاں داخلے کے لیے شرط لگائی گئی کہ سکول کو پانچ ہزار روپے دان دیجئے۔ بچہ داخل ہو جائے گا۔ رشوت کا نام بدل کر انھوں نے دان رکھ دیا تھا۔

اور پھر تیسرا اسکول۔ چوتھا۔ پانچواں۔ کسی نے کہا بچہ ذہین ہے۔ مگر بولتا نہیں شرماتا ہے اور ہم تو صرف بے شرم بچے داخل کرتے ہیں۔

لہٰذا کنڈم !"

کسی نے کہا۔ کہ کسی وزیر کی سفارش ہو تو لاؤ۔ وزارتی سفارش کے بغیر ہمارے ہاں کسی بچے کو داخل کرنے کا رواج نہیں۔

کسی نے جواب دیا۔ ہم سکول میں نیا کمرہ بنوانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کمرہ بنوا کر دے سکتے ہیں۔ نہیں بنوا کر دے سکتے تو — بچے سمیت جہنم میں جاؤ۔"

اور ایک سکول نے تو جواب دیا کہ ہمارے پرنسپل صاحب یورپ میں ایک کلچرل وفد لے کر گئے ہوئے ہیں اور چونکہ وہی پرنسپل صاحب آپ کے ساتھ بچپن میں کبڈی کھیل چکے ہیں۔ لہٰذا وہی آپ کے بچے کو داخل کر سکتے ہیں۔ ورنہ بائی دی وے عرض ہے کہ بچوں کی تعداد پوری ہو چکی ہے۔ صرف ایک سیٹ خالی ہے اور وہ صرف کسی ہریجن بچے کے لیے مخصوص ہے۔ پرنسپل صاحب پرسوں آنے والے ہیں۔"

میں نے اپنے دوست سے کہا "نریندر شرما جی! برہمن کی بجائے ہریجن بن جائیے۔"

وہ بولے۔ "مجھے منظور ہے۔ برہمن زادے کو علم حاصل کرنا ہے تو ہریجن بننے میں بھی کیا ہرج ہے۔ لیکن ہریجن کیسے بنا جائے گا۔

"بہت آسان ہے اپنے میونسپل کونسلر سے ایک جھوٹا تصدیقی سرٹیفکیٹ لانا پڑے گا۔ کہ یہ واقعی کسی ہریجن فیملی میں پیدا ہوا ہے۔"

تیسرے دن ہم پرنسپل سے ملے تو اس نے کہا "سوری وہ سیٹ تو اسی میونسپل کونسلر کے پوتے کو دے دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ہریجن ہونے کا تصدیقی سارٹیفکیٹ لے آیا تھا۔"

گوشہ نشین باہر نکلا

میں آج کل گوشہ نشین رہتا ہوں۔ گوشہ نشینی مجھے پسند نہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ مجھے دنیا کی اور بھی تو کئی چیزیں پسند نہیں۔ مثلاً مٹر کی ترکاری جو بغیر سوچے سمجھے اتنی مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ مگر میں اسے کھاتا ہوں اور یوں کھاتا ہوں جیسے مرغی کا چوزہ کھا رہا ہوں۔

اور ایک اور چیز مجھے پسند نہیں کہ گذشتہ دنوں ایک کرپٹ لیڈر الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ اس صدمے کے سدباب کے لیئے میں نے اسے ٹیلیفون کیا کہ آپ جیسا کرپٹ آدمی کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا "تم سیاست کی الف ب بھی نہیں جانتے۔ سرتاپا احمق ہو۔"

میں نے اپنی حماقت کا اعتراف کر لیا۔ آدمی وسیع القلب بن جائے

تو ایسے اعتراضات ضرر رساں نہیں لگتے۔ مگر میں نے پھر بھی پوچھا۔ "مگر یہ کیسے ہوا الف تا ب سے شروع کیجیے ۔۔۔"

وہ بولا۔ " دیکھئے میں تو کرپٹ تھا ہی۔ مگر میرا مخالف امیدوار مجھ سے بھی زیادہ کرپٹ تھا۔ مجھے جو ووٹر کرپٹ سمجھتے تھے وہ تیس فیصدی تھے لیکن مخالف امیدوار کی کرپشن سے جو ووٹر آگاہ تھے وہ ستر فیصدی تھے اور چاہتے تھے کہ اس کرپٹ آدمی کو شکست فاش دلا دیں۔ چنانچہ اسے شکست دلانے کے لیے انھوں نے غصے میں آکر مجھے ووٹ دے دیئے اور میں جیت گیا۔

ہاں مجھے وہ کامیاب لیڈر پسند نہیں اور وہ ووٹر پسند ہیں جنھوں نے ایک کرپٹ آدمی کو کامیاب کرا دیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جمہوری نظام قبول کر لیا ہے تو بہ امر مجبوری کرپٹ لیڈروں کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ جمہوریت ایک مجبوری ہے بلکہ مجبوری ہی جمہوریت ہے اس لیئے اسے پسند کرو یا نہ کرو۔ وہ تو موجود رہے گی ہی۔

چنانچہ گوشہ نشینی مجھے پسند نہیں ہے مگر مجبوراً گوشہ نشین بن کر رہتا ہوں۔ جس گھر کو اپنا گوشہ بنا رکھا ہے وہ مجھے البتہ پسند ہے کیونکہ ہاؤس ٹیکس انسپکٹر مجھ سے ایک سو ایک روپیہ رشوت لے کر اسے منظور کر گیا تھا۔ وہ تو دو سو ایک روپیہ مانگتا تھا مگر میں نے التجا کی کہ میں فی الحال ایک سو ایک روپیہ رشوت دے سکتا ہوں اس لیئے تھوڑی سی انسانیت برتیے۔

اس نے انسانیت برتی، اور میں قائل ہو گیا کہ رشوت خوری میں

بھی انسانیت ہوتی ہے۔

میرے اس گوشہ نما کمرہ میں خاموشی ہے۔ خاموشی میں مجھے مسرت ملتی ہے۔ (پہلے نہیں ملتی تھی۔ اب نجانے کیوں ملنے لگی ہے؟) لیکن مسرت مسلسل ملتی رہے تو آدمی اکتا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک آدمی جب آٹھ دس کروڑ روپے کا مالک بن گیا۔ تو اکتا گیا اور اپنے دفتر کی چھٹی منزل سے گر کر خودکشی کر لی۔ چنانچہ میں بھی خودکشی کے خوف سے ایک دن اس کمرے سے باہر نکل آیا۔ سوچا زندہ انسانوں کے ہجوم میں گھس جاؤں اور وہاں سے کچھ اُداسیاں اکٹھی کر لاؤں۔ مسرت ایک مرض بن جائے تو اس کا شافی نسخہ اداسی ہے۔ جو مسرت کی اکتاہٹ کو دور کر دیتی ہے۔

باہر سڑک پر آیا۔ تو حنیف احمد بڑھئی سے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد پوچھا "حنیف تم تو اب کبڑے ہو گئے ہو۔ تمہارے جسم میں تو ایک سال پہلے تو بڑا سلیقہ اور استحکام تھا۔"

اس کا گلا رندھ گیا۔ بولا "آپ میری بیٹی زیبو کو تو جانتے تھے۔ وہ دونوں کانوں سے بہری ہو گئی۔"

"کیسے کیسے؟ وہ تو تنگ رسک سے آسمانی حور لگتی تھی۔"

جی! حور کیا تھی، بے وقوف تھی۔ محلے میں بھگوانی جاگرن سننے چلی گئی۔ جہاں ایک دیوی ماتا لال لال زبان لٹکائے گھنٹہ بھر تک سر کے بال گھماتے رہی۔ زیبو واپس آئی تو بولی "ابا۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ اور پھر پانچ دن تک یہ چکر

چکر ختم نہ ہوا۔ تو میں اسے ایک سرکاری ہسپتال میں لے گیا۔ مہینہ بھر ہسپتال میں علاج ہوتا رہا۔ چکر تو ختم ہو گئے مگر کانوں سے بہری ہو گئی۔

حنیف احمد کا کبڑا پن، زبیدہ کے بہرے پن کا شدید ردعمل تھا۔ آہ بھر کر کہنے لگا۔ فکر بابو، اب کسی عمارت میں کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ دن بھر اداس رہتا ہوں۔

یہ اُداسی کا پہلا ڈوز تھا جو گوشہ نشین کو ملا۔ حنیف کو رسمی تسلی دے کر آگے بڑھ گیا کیونکہ اس صنعتی دور میں رسمی تسلیوں کے سوائے ہمارے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ بلکہ کئی حضرات کو تو یہ شکایت ہے کہ ہمیں رسمی تسلی کے لیے بھی ٹائم نہیں ملتا۔

آگے ایک پبلک پارک تھا جہاں چالیس پچاس عورتوں کا ایک جلسہ سا ہو رہا تھا۔ تیس چالیس مرد بھی تھے۔ بلکہ دو تین مرد تو عورتوں کی بیداری کی تعریف بھی کر رہے تھے۔ ایک نوجوان زیادہ اور حسین اس سے بھی زیادہ لڑکی تقریر کر رہی تھی۔ گوشہ نشین کو افسوس ہوا کہ میری عمر بغیر سوچے سمجھے کچھ زیادہ آگے بڑھ گئی۔ ورنہ اس لڑکی سے عشق کرنے کی کافی گنجائش نکل سکتی تھی۔ بالکل غزل کا ایک پھڑکتا ہوا شعر تھی وہ حسین لڑکی۔

اور وہ لڑکی آسمان کی طرف مکے ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی "بہنو! اپنے بزدلانہ خوابوں میں زندگیاں ضائع مت کرو۔ محلے میں جس نئی دلہن کو جہیز کے چند ٹکوں کے نام پر جلا دیا گیا۔ اب تم ڈوب مرو یا ابھر کر نکلو، اور اس ساری بلڈنگ کو جلا دو۔ جہاں نوجوان لڑکیوں کو پھونک دیا جاتا ہے۔ کیا تم یہ برداشت

کر سکتی ہو؟

"نہیں، نہیں، نہیں"

میں سمجھ گیا۔ دو برس پہلے جب میں گوشہ نشین ہوا تھا۔ تو بھی جہیز کی یہ وارداتیں ہو رہی تھیں۔ اور عورتیں بھی بیدار ہو رہی تھیں۔ دو برس بعد باہر نکلا تو وارداتوں کی تعداد دوگنی ہو گئی تھی۔ عورتوں کی بیداری بھی دوگنی ہو گئی تھی۔ دو برسوں میں اداسیاں بھی اتنی نہیں رہی تھیں۔ دوگنی ہو گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ جلسہ ایک جلوس کی شکل میں بدل گیا۔ نعرے لگاتی ہوئی عورتیں اس بلڈنگ تک پہنچیں۔ جہاں دلہن جلائی گئی تھی۔ بلڈنگ پر موٹا تالہ لگا ہوا تھا۔

کسی نے پوچھا "وہ قاتل کہاں چلے گئے۔؟"

میرے منہ سے نکلا "ایک اور بہو کو جلانے چلے گئے۔ جو ان کی دوسری بلڈنگ میں رہتی ہے"

میرے فقرے پر سب نے بیساختہ قہقہہ لگایا۔ مجھے اس قہقہے کی تہوں میں اداسی کی لہر کپکپاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور میں بھاگ کر پھر اپنے کمرے کی طرف بھاگا جہاں خامشی تھی اور مسرت۔

چناؤ امتحانی پرچہ

صرف فلم اسٹاروں کے لیئے۔ (اس امتحانی پرچہ کو اس پس منظر میں حل کیجئے کہ کچھ فلم اسٹار لوگ سبھا کا چناؤ لڑنا چاہتے ہیں۔)

پاس مارکس: پاس ہونے کی کوئی قید نہیں صرف زیرِ ضمانت بچ جائے تو اسے بھی پاس سمجھا جائے گا۔

ہدایات: (۱) ہر امیدوار حل شدہ پرچے کے ساتھ اپنا فوٹو بھی نتھی کرے۔ پوز قاتل کٹار قسم کا ہونا چاہیئے، ورنہ پانچ نمبر کاٹ لیے جائیں گے۔ ایکٹروں کو فوٹو بھیجنے کی ضرورت نہیں، وہ سب دیکھے بھالے ہیں (۲) کمرۂ امتحان کے نگران کی طرف سے "پولیٹیکل سائنس" نامی کتاب ہر امیدوار کو سپلائی کی جائیگی۔ اس میں سے نقل مار کر بھی پرچہ حل کیا جا سکتا ہے۔ نقل میں عقل کے استعمال کی کوئی پابندی نہیں۔ (۳) پرچے کے شروع میں اپنا پیدائشی نام لکھیئے (چاہے بھونڈا۔

ہی کیوں نہ ہو اور اپنا فلمی نام بھی لکھیے (چاہے وہ اصلی نام سے بھی بھونڈا کیوں نہ ہو) (۴) تمام سوالات حل کیجیے۔ آزمائش شرط ہے، کامیابی اللہ تعالیٰ اور ووٹروں کے ہاتھ میں ہے۔

اب اللہ اور ووٹر کا نام لے کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیجئے۔

پہلا سوال:۔ مندرجہ ذیل ضمنی سوالوں کا جواب صرف ایک ایک لفظ میں دیجیے۔

اگر نواب پٹوڈی اور شرمیلا ٹیگور دونوں ایک ہی سیٹ سے کھڑے ہو جائیں تو کون جیتے گا؟

• دونوں میں سے کون کرپٹ ہے، ماسٹر چندگی رام یا دارا سنگھ؟

• اگر ایک ساتھ بمبئی کے پارلیمانی حلقے سے شری ایس کے پاٹل اور سنیل دت ایک دوسرے کا مقابلہ کریں تو دونوں میں سے کس کی ضمانت ضبط ہو گی؟

مسٹر راج نارائن کے مقابلے پر مندرجہ ذیل میں سے کونسا امیدوار موزوں رہے گا۔

ٹن ٹن، یا بورا دیپٹیل مقری۔

دوسرا سوال:۔ ذیل میں چند فلمی شخصیتوں کے نام دیئے گئے ہیں، اور ان کے سامنے یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ وہ کونسی سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔ اگر یہ ترتیب صحیح ہے تو جواب میں صرف "یس" لکھ دیجئے اور اگر غلط ہے تو ترتیب کو صحیح کر لیجئے۔

۱۔ دلیپ کمار --- جن سنگھ کے ٹکٹ پر

۲۔ راجندر کمار ـــ شو سینا کے ٹکٹ پر

۳۔ خواجہ احمد عباس ـــ مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر

۴۔ راجیندر سنگھ بیدی ـــ اکالی ٹکٹ پر

۵۔ سائرہ بانو ـــ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر

۶۔ شبانہ اعظمی ـــ سنڈیکیٹ کے ٹکٹ پر

۷۔ سُنیل دت ـــ وشال ہریانہ پارٹی کے ٹکٹ پر

اپنے جواب کے ساتھ مضبوط دلائل بھی دیجئے کہ یہ ترتیب غلط ہے تو کیوں؟ اور اگر صحیح ہے تو کیوں؟ جس طالب علم فلم اسٹار کی پوری ترتیب صحیح ہو گی اس کا انکم ٹیکس معاف کر دیا جائے گا۔

تیسرا سوال :۔ ممبران پارلیمنٹ بننے کے لئے فلم اسٹاروں میں وہ کونسی خصوصیات ہونی چاہئیں جن کی بنا پر وہ الیکشن میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل خصوصیات کی روشنی میں جواب لکھیئے :

(۱) مہینے میں ایک بار اپنے بنگلے میں بھگتی جاگرن کراتا ہو۔ (۲) انکم ٹیکس کی چوری کرتا ہو (۳) اپنا معاوضہ کالے دھن کی شکل میں وصول کرتا ہو۔ (۴) فلموں میں ادھ ننگے جسم کی نمائش کرتا ہو یا کرتی ہو۔ (۵) ہر سال نئی بیوی یا نیا شوہر یا نیا مکان بدلتا ہو۔ (۶) غیر ملکی شراب اسمگل کرتا ہو، اور اپنی ہر فلم میں دیش بھگتی کا پرچار بھی کرتا ہو۔ (۷) بمبئی اور دہلی کے اعلیٰ ترین اور گراں قدر ہوٹلوں میں شب باشی کرتا ہو اور وہاں بیٹھ کر غریدوں کے افلاس پر آنسو بہاتا ہو۔

(نوٹ) ان مشہور و معروف خصوصیات کے علاوہ اپنے ذاتی تجربے کی

بیچتی تھی۔ اور اُن کا گیارہ برس کا بچہ ایک پکوڑوں کی دکان پر گاہکوں کو آوارہ گرد اوباش عورتوں کے ایڈریس اور ریٹ بتاتا تھا۔ یعنی شیر کا بچہ عورتوں کا دلال بن گیا تھا۔

اور رات کو اس فیملی کے تینوں ممبر ایک سلم ایریا کی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا۔ کہ تامل ناڈو کا گاؤں انہوں نے اس لیے چھوڑا۔ کہ وہاں ہم بھوکے مرتے تھے۔ جاگیرداری نظام ختم ہونے کے باوجود انھیں زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا۔ اس لیے ہم شہر میں آگئے۔ اور بھگوان نے چاہا تو چار پانچ برس میں ہمارا پورا گاؤں اجڑ کر یہاں آبسے گا۔

گویا شہر ان کے لیے ایک رفیوجی کیمپ بنتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی چار پانچ بڑی بڑی ذاتیں ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی چھوٹی چھوٹی ذاتیں بھی جی رہی ہیں۔ ہندوستان ذاتوں سے بھرا پرا ملک ہے۔ خدانخواستہ اگر ہندوستان سے ذاتیں بھاگ جائیں۔ تو یہ ملک افریقہ کا صحرائے گوبی بن کر رہ جائے۔ ہندوستان کو اگر صحرا بننے سے بچا رکھا ہے تو انہی ذاتوں نے۔ جو اس ملک میں صدیوں سے یوں زندہ ہیں۔ جیسے یہ ذاتیں نہ ہوں۔ خودرو پودے ہوں۔ ایک پودا مرجھا جاتا ہے تو اس کی بغل میں سے دو تین اور خودرو پودے اگ آتے ہیں۔

عورتوں میں یہ خودروئی زیادہ ہے۔ یہاں زندگی میں اگر رنگ و رونق قائم ہے۔ تو ایسی چھوٹی چھوٹی ذات کے سہارے ابھرنے والی عورتوں کی بدولت۔

مثلاً ہندوستان میں جو عورتیں بیدار ہو گئی ہیں۔ وہ ہوٹلوں میں کیبرے

بنا پر کچھ اور خصوصیات بھی درج کرو، جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔ شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سیاست اور فلم کی وادی میں شرم و حیا "آؤٹ آف ڈیٹ" ہو چکی ہیں۔

چوتھا سوال :- (الف) مندرجہ ذیل میں فرق واضح کیجئے :

(۱) ناکام فلم ساز اور ناکام سیاست داں۔ (۲) شو سینا اور اپسا۔ (۳) راجیش بہل اور شام بہل۔ (۴) کرکٹ اور پالیٹکس۔ (۵) شرمیلا ٹیگور اور جھگی جھونپڑیاں۔
(۶) فلم اسٹوڈیو اور پارلیمنٹ۔ (۷) گلشن نندہ اور گلزاری لال نندہ۔

(ب) مندرجہ ذیل میں مشابہت کیجئے :

(۱) نیم عمریاں ایکٹریس اور نیم عریاں ووٹر (۲) اسٹنٹ فلم اور سنڈیکیٹ۔
(۳) اوم پرکاش اور ہری سنگھ کی گنجی چندیا (۴) پرانی طوائفیں اور نئی ایکٹریس۔
(۵) بنڈل فلمیں اور بنڈل لیڈر۔ (۶) جارج فرنانڈیس اور بال ٹھاکرے۔

پانچواں سوال :- دلائل سے اس دعوے کو رد کیجئے کہ اگر فلم اسٹاروں کا ایک گروپ کامیاب ہو کر لوک سبھا میں پہنچ جائے تو وہ مندرجہ ذیل مطالبات ہرگز لوک سبھا میں پاس نہیں کرائے گا۔

(۱) فلم میں بوس بازی کی اجازت دی جائے (۲) فلم اسٹاروں کے انکم ٹیکس کی پڑتال کا رواج منسوخ کر دیا جائے۔ (۳) عامیانہ اور بازاری فلموں کو تفریحی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں دھار مک فلموں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے (۴) کسٹم پر فلمسازوں سے کوئی پوچھ تاچھ نہ کی جائے (۵) بھونڈے اور کریہہ صورت والے سیاسی لیڈروں کے حسین و جمیل ایکٹریسوں کے ساتھ فوٹو

کھنچوانے کو خلاف قانون قرار دیا جائے (۶) چھ سال کی عمر سے لے کر پندرہ سال تک کی عمر کے بچوں کو بلوغت کا سرٹیفکیٹ دے کر یہ فلمیں دیکھنے کی کھلی اجازت دی جائے۔ کیونکہ اس عمر کے فلم بین ہی درحقیقت فلم اسٹاروں کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ فلم اور گوکا کولا دونوں کی صنعت ان بچوں ہی کے سہارے کھڑی ہے۔

چھٹا سوال :۔ نیچے ایک انتخابی تقریر کا اقتباس دیا جا رہا ہے، اس تقریر کو تین بار غور سے پڑھو اور پھر بتاؤ یہ کس فلم کی ہیروئن کی تقریر ہے۔ اس تقریر میں جو پولیٹکل حماقتیں کی گئی ہیں ان کو ترتیب وار لکھو اور بتلاؤ کہ ان حماقتوں کا ہندوستان کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا، اور یہ بھی تحریر کرو کہ اگر ایسی تقریر کوئی سیاسی لیڈر کرتا تو لوگ اس پر گندے انڈے پھینکتے یا کرنسی نوٹ؟

تقریر کا اقتباس یہ ہے :

"میں اپنے ووٹران سے اپیل نہیں کروں گی۔ کیونکہ میری سیکس اپیل ہی سب سے بڑی اپیل ہے۔ یہ اپیل ناقابل شکست ہے۔ میری ہرنی ایسی متوالی اور خواب گوں آنکھیں اس دیش کے تنکوں کی جھونپڑیاں دیکھ رہی ہیں۔ میرے جسم کی کافر شکن قوسوں میں پڑے ہندوستان کی پہاڑیاں اور ندی نالے اور جھرنے ابھر رہے ہیں۔ میری یہ قوسیں سیکولر قوسیں ہیں۔ ان قوسوں میں نہ ذات پات کا فرق پایا جاتا ہے نہ مذہبی تعصب اور نہ علاقائی تنگ نظری کا۔ پیار سے دیکھا میرا جسم برق ہے ہر زبان میں برق ہے، مرہٹی، تامل اور ہندی۔ میری زلفیں بنگالی بھاشا بولتی

ہیں۔ میرے سُرخ و سپید سیبوں ایسے رخسار بتا رہے ہیں کہ کشمیر ہمارے ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ میں جب ریشمی لہنگا پہن کر آزاد پہاڑیوں پر کودتی اور اچھلتی ہوں اور "لاراللا" کے بول پھینکتے ہوئے قوم کے لیئے فلمی گیت گاتی ہوں تو ہنگامی کا دم رک جاتا ہے۔ بلیک مارکیٹیئے، کرپٹ افسر اور کالے دھن کے مالک سب ہی میری آواز کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیئے میرے پیارے ووٹرو! اگر ہندوستان کو کرپٹ افسروں اور بلیک مارکیٹروں سے بچانا چاہتے ہو، تو مجھے ووٹ مت دو بلکہ میرے رخساروں، زلفوں اور جسم کی کافرادا قوسوں کو ووٹ دو۔ میں ان کی بے پناہ سحر آفریں طاقت سے تمہارے سارے دکھ دور کر دوں گی۔ میری ایک نگاہ فتنہ ساماں اٹھنے کی دیر ہے کہ سوشلزم کی بال میری مٹھی میں آجائے گی اور گول ہو جائے گا۔ شاستری جی نے نعرہ لگایا تھا "جے جوان، جے کسان!" مگر میرا نعرہ ہے "جے زلف و رخسار، جے فلم اسٹار!"

ساتواں سوال:۔ ریاضی کے اس پیچیدہ سوال کا سادہ سا حل نکالو:

(الف) فنانسر + کالا دھن ــــ پروڈیوسر ــــ ڈائریکٹر ــــ فلم اسٹار × فلم بین ÷ سینما کی بلیک میں بکی ہوئی ٹکٹ ═══ سوشلزم زندہ باد!

(ب) ایس۔ کے۔ پاٹل میں اگر بیما مالنی کو جمع کر دیا جائے اور انھیں نواب پٹوڈی سے ضرب دے کر اس میں سے شرمیلا ٹیگور کو تفریق کر دیا جائے تو باقی کیا

بچے گا؟

آٹھواں سوال :۔ کیا وجہ ہے کہ ایک فلم ایکٹریس کو پردۂ فلم پر عشوہ طرازیاں کرتے دیکھ کر ووٹر لوگ داد تحسین کی تالیاں بجاتے ہیں۔ لیکن وہی فلم ایکٹریس سیاسی اسٹیج پر عشوہ طرازیاں کرتے ہوئے نمودار ہوتی ہے تو ووٹر اسے ہوٹ کر دیتے ہیں۔

دونوں عشوہ طرازیوں میں فرق کے اسباب بیان کرو۔

نواں سوال :۔ اگر دہلی کی سات پارلیمنٹری سیٹوں پر مندرجہ ذیل امیدوار مقابلے پر کھڑے کر دیئے جائیں تو ان میں سے کون جیتے گا اور کون ہارے گا؟

۱۔ راج نرائن کے مقابلے پر ششی ششو۔

۲۔ سائرہ بانو کے مقابلے پر بلراج مدھوک۔

۳۔ جانی واکر کے مقابلے پر چرن سنگھ۔

۴۔ تارکیشوری سنہا کے مقابلے پر شبانہ اعظمی۔

۵۔ آئی۔ ایس جوہر کے مقابلے پر جانی واکر۔

۶۔ اوم پرکاش کے مقابلے پر کملا پتی ترپاٹھی

۷۔ وجینتی مالا کے مقابلے پر ننگا۔ یعنی چندر شیکھر۔

دسواں سوال :۔ فرض کیجئے فلم اسٹار نرو پا رائے اپنے پارلیمنٹری حلقے سے قریب قریب شکستہ فاش کھا جاتی ہے، تو بتائیے اسے شکست فاش دینے کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ اپنا جواب مندرجہ ذیل میں تلاش کیجئے:

(۱) پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کے فلم بین طالب علم (۲) گرہستی عورتیں (۳) ٹیلیفون آپریٹر چھوکریاں (۴) سوئمنگ کیل گرلز (۵) اسکولوں کی

استانیاں (۶) اسپتالوں کی سانولی سلونی نرسیں (۷) کالجوں کے بوڑھے اور گرلز فرینڈز (۸) بوگس ووٹرز (۹) پچاس برس سے اوپر کی عمر کے بابو لوگ (۱۰) حلقے کے جیب کترے، غنڈے، آوارہ گرد، جھوکرے، رکشا پلر، تانگے بان، ٹیکسی ڈرائیور وغیرہ (۱۱) مذہبی خیالات رکھنے والے شرفا (۱۲) اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ جیسے پروفیسر، ڈاکٹر، وکیل، انجینئر، ادیب اور مصور۔

خاص نوٹ:۔ اپنے جواب کے ساتھ ان اسباب پر بھی بحث کیجئے کہ ووٹروں کی مندرجہ بالا اقسام میں سے کس نے اور کیوں بے چاری نرد پارائے کو ووٹ نہیں دیا، اور جنہوں نے دیا انھیں نرد پارائے سے والہانہ محبت کیوں تھی؟

دوسرا خاص نوٹ:۔ اگر نرد پارائے اپنے حلقے سے خدانخواستہ کامیاب ہو جائے تو وہ مندرجہ بالا اقسام میں سے کون سے ووٹروں کی نمائندہ کہلائے گی؟

گیارھواں سوال:۔ وہ اپوزیشن لیڈر جو کنوارے ہیں۔ کیا آپ کسی ایسے فلم اسٹار کا نام بتا سکتے ہیں جو مندرجہ ذیل شرائط پوری کر سکے۔

(۱) کنوارا ہو (۲) کالا ہو (۳) انگریزی نہ جانتا ہو (۴) نیت بھی سیاہ فام ہو۔ (۵) راج گوپال آچاریہ کو استاد مانتا ہو (۶) ہر بھجن لال کی ضمانت ضبط کروا سکتا ہو۔

اگر کوئی مرد فلم اسٹار ان شرائط پر پورا اترتا ہو تو کسی خاتون فلم اسٹار پر نظر دوڑائیے۔ کیونکہ وہاں جواب ملنے کا زیادہ چانس ہے۔

بارھواں سوال:۔ اگر مشہور انقلابی گیت کار مجروح سلطان پوری کو پنجاب کے لدھیانہ پارلیمنٹری حلقے سے کھڑا کر دیا جائے تو دلائل و شواہد سے ثابت کرو کہ وہ کس قسم کے لوگوں سے اپنے ووٹ کھینچ سکے گا۔

(۱) کنواری لڑکیاں (۲) نیلی پگڑی والے اکالی (۳) کمیونسٹ پارٹی (دائیں، بائیں، درمیانے اینگلو اسٹیبلشمنٹ سبھی) (۴) ہزاری دالے (۵) شاعر اور ادیب (۶) ان پڑھ اور پڑھے لکھے جاٹ (۷) اہل اسلام۔

نوٹ:۔ یہ بھی تحریر کیجئے کہ اگر مجروح سلطان پوری کے مقابلے پر سابق چیف منسٹر اور سابق چیف جج اور سابق اکالی .... کھڑا ہو جائے تو دونوں امیدواروں میں کس کی شکست کے چانس زیادہ روشن ہیں۔

تیرھواں سوال:۔ ایسے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے نام تلاش کیجئے جنہوں نے مندرجہ ذیل عوامی محاذوں پر کام کیا ہو اور اسی لیے اپنے آپ کو پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے اہل سمجھتے ہوں:

(۱) تانگہ ریڑھا یونین (۲) انجمن یادگار شہیدان وطن (۳) آل انڈیا ڈانسنگ اینڈ سنگنگ گرلز ایسوسی ایشن (۴) بھارتیہ نشہ بندی اندولن (۵) اندرا ہٹاؤ، گائے بچاؤ تحریک، (۶) گھریلو کرمچاری سنگھ (۷) انگریزی بورڈ ہٹاؤ تحریک (۸) کل ہند مورکھ منڈل (۹) اردو زبان کے حق میں دستخطی مہم (۱۰) زیادہ اناج اگاؤ مہم۔

اگر ان عوامی محاذوں پر کام کرنے والا کوئی فلم اسٹار باوجود تلاش بسیار کے نہ مل سکے تو کوئی حرج نہیں۔ جواب کے لیے خالی جگہ چھوڑ دیجئے۔ خالی جگہ کے زیادہ نمبر مل جائیں گے۔

چودھواں سوال:۔ ایک مشہور فلمی ہیرو نے الیکشن کی سکرین پر نمودار ہونے سے پہلے ایک پریس کانفرنس بلائی جس میں وہ احتیاطاً اپنی نرگسی آنکھوں والی ہیروئن کو بھی" اخلاقی طاقت" کے طور پر اپنے ہمراہ لے آیا اخباری نمائندوں کے سیاسی

سوالوں کے جو جواب اس فلمی ہیروئن نے دیئے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔
ان جوابوں میں وہ جواب بھی شامل ہیں جو بیچ بیچ میں موقعہ سے فائدہ اٹھا کر فلمی ہیروئن نے دے دیئے۔ تم ان سوال و جواب کا بغور مطالعہ کرو اور بتاؤ کہ (۱) کون سے سوالوں کے جوابات بالکل صحیح دیئے ہیں (۲) کون سے جوابات ہیروئن نے دیئے ہیں؟

سوال:۔ مسٹر دلیپ کمار، راجندر کمار، راج کمار، پردیپ کمار، اسول کمار یا جس قسم کا کمار بھی آپ ہیں! آپ کے خیال میں فلم ایکٹنگ اور سیاسی ایکٹنگ میں کون سی خصوصیت ہے؟

جواب:۔ ایکٹنگ

سوال:۔ بمبئی کی غلیظ اور تنگ و تاریک "چالیں" کس خوبی کی مالک ہیں۔

جواب:۔ فوٹو گرافی کے اعتبار سے تو بڑی رومانٹک لگتی ہیں۔

سوال:۔ آپ اپنی فلموں میں غریب عوام کی ناگفتہ بہ حالت پر آٹھ آٹھ آنسو کیوں روتے ہیں؟

جواب:۔ ڈائریکٹر کے کہنے پر۔

سوال:۔ کیا آپ پارلیمنٹ میں بھی اسی طرح آٹھ آٹھ آنسو روئیں گے؟

جواب:۔ ہاں، اگر وہاں بھی کوئی ڈائریکٹر موجود ہوا تو ضرور روؤں گا۔

سوال:۔ اگر آپ کا جوہو والا بنگلہ غریب بچیروں کو دے دیا جائے، تو.....؟

جواب :- ہم مچھیروں کے خلاف سپریم کورٹ میں دعویٰ دائر کریں گے۔ کیونکہ کسی کی جائداد کا بنیادی حق چھیننا غیر آئینی حرکت ہے۔

سوال :- حکومت کی درآمدی پالیسی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب :- غیر ملکی لپ اسٹک کی درآمد پر سے پابندی ہٹا دینی چاہیے۔

سوال :- صرف لپ اسٹک؟

جواب :- نہیں، فرانسیسی شراب پر سے بھی۔

سوال :- پارلیمنٹ میں آپ ہیروئن کے بغیر کیسا ایکٹنگ کریں گے؟

جواب :- آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہیروئن بھی الیکشن لڑ رہی ہے۔ اور اس کی کامیابی زیادہ یقینی ہے۔

سوال :- ملک میں نوجوانوں کی تشویشناک بے روزگاری کا کیا علاج ہے؟

جواب :- بے روزگاری کے خلاف فلمیں بنانا۔

سوال :- اگر آپ راجہ ہوتے اور آپ کا پریوی پرس آپ سے چھین لیا گیا ہوتا تو پارلیمنٹ میں آپ کا کیا رویہ ہوتا؟

جواب :- ہم کہتے کہ یہ سوشلزم ہے یا غنڈہ گردی

سوال :- آپ کو ہندوستانی عوام کیوں اچھے لگتے ہیں؟

جواب :- کیونکہ وہ ہم سے آٹوگراف لیتے ہیں؟

سوال :- پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے بعد آپ سب سے پہلا کام کیا کریں گے؟

جواب :- اپنی تھکان اتارنے کے لیے منالی ہل اسٹیشن چلے جائیں گے۔

سوال :- اور اگر آپ الیکشن میں ہار گئے تو کیا کریں گے؟

جواب :- پھر فلموں میں کام کریں گے۔

چور کی مصیبت

چند دن ہوئے میں کمرے میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اب دنیا بہت دیکھ لی ہے، اس لیے خودکشی کر لینا چاہیے کہ اتنے میں دھڑاک سے دروازہ کھلا۔ اور ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میرے پاؤں پکڑ لیے۔

میں نے کہا۔ "کون ہو تم، کیا چاہتے ہو؟"

"میں چور ہوں جناب۔"

"تو چور رات میں آتے دن میں کیوں آئے ہو؟"

چور جواب دینے کی بجائے رونے لگا۔ جوں جوں رونے کا ٹیمپو تیز ہوتا گیا وہ میرے پاؤں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا۔ جس سے میرے پاؤں بری طرح دکھنے لگے۔ میں نے التجا کی۔ "چور صاحب رونا بند کر دیجیے،

کیونکہ آپ کے رونے سے میرے پاؤں کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

"میں نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے گڑگڑا کر دھمکی دی۔ "میں چور ہوں، میں نے چوری کی ہے۔ مجھے سزا دلوایئے۔ مجھے ہتھکڑی لگوایئے۔ ورنہ میں ....."

عجیب چور ہے — میں نے سوچا۔ چوری بھی کرتا ہے، سزا بھی چاہتا ہے۔ یہ چور ہے یا بیوقوف۔ میں نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش آدمی تھا۔ چہرے پر شگفتگی سی تھی جو یا تو تازہ پھل کھانے سے آتی ہے۔ یا ہر روز مندر جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ صرف آنکھوں کے کونوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنا پیشہ صحیح بتا رہا ہے۔

میں نے اپنے پاؤں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی خاطر فوراً ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا — "تمہیں ضرور سزا ملے گی دوست لہٰذا میرے پاؤں چھوڑ دو۔"

چور میری دانشمندی کی گرفت میں آ گیا اور اپنے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور پھر ایک گٹھڑی کھولتے ہوئے بولا "پرسوں رات میں نے ایک گھر سے یہ مال چرایا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس جرم کی سزا ملنی چاہیئے فوراً کے لیے میری مدد کیجئے اور مجھے جیل بھجوا دیجئے۔"

میں مسکرایا۔ چوری مذموم حرکت ہے مگر چوری کی سزا چاہنا اور بھی مذموم حرکت ہے۔ اس سے تو چوری کے فلسفہ کی بنیادیں ہی اکھڑ جائیں گی۔ چاہے کچھ ہو، چوری کی اپنی ایک بنیادی تاریخ ہے، روایات ہیں،

ڈانسر بن جاتی ہیں اور جو کچھ زیادہ بیدار ہو گئی ہیں۔ انہوں نے ڈانسنگ سکھانے والے اسکول کھول دیئے ہیں۔ جہاں ڈانس کم سکھایا جاتا ہے، مہذبانہ جنسی تربیت زیادہ دی جاتی ہے۔ اس تربیت کی داد دینے کے لیے بڑے بڑے امیرزادے نوجوانوں کو بطور چیف گیسٹس مدعو کیا جاتا ہے۔

کچھ بیدار عورتیں راتوں کو پوش کلبوں کی زینت بنتی ہیں۔ وہاں مردوں کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلتی ہیں۔ اور عام طور پر جیت جاتی ہیں۔

کچھ عورتوں کو دن بھر اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ تو وہ شام کے وقت شاپنگ کے لیے نکل جاتی ہیں۔ وہ روزانہ شاپنگ نہ کریں۔ تو سمجھتی ہیں، یہ جیون اکارت گیا۔ وہ دن بھر میں دو درجن لباس بدلتی ہیں اور جیون کو اکارت ہونے سے بچاتی ہیں۔ عبادت گاہوں کا زیادہ تر انحصار عورتوں کی موجودگی پر ہوتا ہے۔ ہندوستان کا ہر مذہب فقط عورتوں کے ستون پر سر بلند کیے کھڑا ہوا ہے۔ ان میں سے اکثر خاوند کی بجائے بھگوان کو پانے کے لیے گھنٹوں عبادت خانوں میں اپنا سر، اپنا ضمیر اور اپنا دھن دھوتی رہتی ہیں۔

اور پھر عورتوں کی ایک ذات بالاخانوں پر بیٹھتی ہے۔ ان کی روح کو مسلسل دُرّے مار مار کر معطل کر دیا جاتا ہے۔ اور صرف جسم کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ ان کے جسم کی عمر زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال ہوتی ہے۔ چار پانچ سال تک جب ان کے جسم کو گرم گرم گوشت سمجھ کر کھا لیا جاتا ہے۔ تو باقی سوکھی ہڈیاں رہ جاتی ہیں۔ اور دلال ان ہڈیوں کو میونسپلٹیوں کے کوڑے دان کی طرف اچھال کر پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر ایک ذات بھکارنوں کی ہوتی ہے جنہیں ہندوستانی باشندے

اسلوب ہیں، فنی نزاکتیں اور لطافتیں ہیں ..... یہ سب چیزیں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ یقیناً یہ شخص پاگل ہے۔

"تم کیسی سزا چاہتے۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے تھانے بھیج دیجیے۔"

"پاگل خانہ کیسا رہے گا؟"

چور پھر رونے لگا۔ "جہاں جاتا ہوں یہی جواب ملتا ہے۔ مجھے کہیں انصاف نہیں ملتا۔ اور اب تو کسی سے انصاف طلب کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ آہ فکر صاحب! انصاف کی موت ہو چکی ہے اور انصاف کے قاتلوں میں آپ بھی شامل ہو گئے ہیں۔"

اس کا گلا رندھ گیا۔ روتے روتے اس نے پھر میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اب کے گرفت زیادہ ٹھونک تھی۔ میں نے سوچا کہ چور کے ہاتھ مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اور اگر میں نے اسے چل دھوایا تو یہ ہاتھ میری گردن بھی توڑ سکتے ہیں۔ اس لیے دانشمندی دکھائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً کہا۔

"چلو دوست تمہیں چایا لگوا لاؤں۔"

پاپ کی گٹھڑی کندھے پر رکھے ہم دونوں تھانے کی طرف چل دیئے کیونکہ تھانے والا میرا دوست تھا اور جرم کی نہیں بلکہ مجرموں کی بیخ کنی میں مہارت رکھتا تھا۔ راستہ میں ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی کہ جو بھی ملتا چور کو مؤدبانہ سلام کرتا۔ میرا جی چاہا ان سے کہہ دوں کہ یہ چور ہے۔ اسے سلام کرنے سے سماج کی بلند پایہ اخلاقی قدروں کو گزند پہنچے گا۔ لیکن یہ سوچ کر چپ رہا کہ ہر آدمی کے خیال کو عمل کی آزادی ہے۔ میرا

کیوں دخل دوں۔ البتہ چور کی سماجی پوزیشن پر مجھے بہت رشک آیا۔

تھانیدار مجھے دیکھتے ہی سلام کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چور نے بھی تھانیدار کو سلام کیا جس کا جواب تھانیدار نے یوں دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"شٹ اپ۔!"

میں نے چور کے لیے بھی ایک کرسی منگوائی (جس پر تھانیدار نے دانت پیسے) اور پھر میں نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور انسانیت کے نام پر اس سے اپیل کی کہ چور کو ہتھکڑی پہنا دی جائے۔

واقعہ سنکر تھانیدار قدرے حیران ہوا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ چور کے لیے اس کے دل میں تھوڑی سی توقیر پیدا ہوئی ہے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"فکر صاحب! تہذیب یافتہ پولیس صرف اس آدمی کو گرفتار کرتی ہے، جس کے خلاف رپورٹ درج کی جائے۔ اور آپ جانتے ہیں تہذیب ان سے زیادہ بلند چیز ہے۔"

چور مغلوب ہو گیا۔ بولا۔ "میں خود اپنے خلاف یہ رپورٹ کر رہا ہوں۔"

"دیکھئے جذبات میں مت آئیے۔" تھانیدار نے اب کے چور کو کریڈٹ بھی پیش کر دیا۔ "سوال قانون کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ چور موجود ہے، چوری کا مال بھی موجود ہے۔ لیکن مال کا مالک کہاں ہے؟ مدعی کہاں ہے؟ نہیں صاحب! جب تک تینوں چیزیں موجود نہ ہوں ہتھکڑی نہیں پہنائی جا سکتی۔ ہتھکڑی صرف

ملزم کی کلائی میں پڑ سکتی ہے، مگر ملزم کون ہے؟"

"میں ہوں۔" چور کو آس بندھ گئی۔

"لوں ہوں۔ پولیس کسی کو چور نہیں کہہ سکتی۔ پولیس کے لیئے یہ سب برابر ہیں۔۔۔ آہ! آپ صرف چور ہیں، کاش کہ آپ نے چوری کے بجائے پولیس میں کام کیا ہوتا۔ تو آپ کو پتہ چلتا کہ انصاف کی دریافت کتنی مشکل ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ہمارے لیئے سب برابر ہیں۔

"مگر میں کیا؟" چور نے بیتابی سے کہا اُسے تھانیدار کے بیان سے بار بار امید بندھ جاتی تھی۔

"آپ؟" تھانیدار نے تھوک نگل کر کہا۔ "آپ بیک وقت چور بھی ہیں اور شریف بھی۔"

تھانیدار کے لہجے میں صداقت تھی، چور کے لہجے میں صداقت تھی۔ مگر صداقتیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ چنانچہ اس مرحلہ پر میں نے مداخلت کرنا مناسب سمجھا اور کہا "تھانیدار جی! آپ اس کیس پر قانون کی نہیں۔ انسانی ہمدردی کی بنا پر غور فرمایئے کہ جرم ہو چکا ہے، مجرم موجود ہے۔ اسے سزا دیجیے۔"

تھانیدار مسکرا دیا۔ ایسی مسکراہٹ ہمیشہ عقلمند آدمی کے لبوں پر اس وقت ابھرا کرتی ہے جب وہ بے عقلی سے بات کر رہا ہو۔ بولا "مگر صاحب قبلہ! قانون کی بنیاد شناخت پر ہے جرم پر نہیں، انسانیت پر نہیں۔ میں نے عرض کیا نا؟ کہ سب سے پہلے قانون یہ فرض کرتا ہے کہ ملزم بھی جھوٹا

ہے اور مدعی بھی۔ گویا یوں ہم جھوٹ کے ذریعہ سچ کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔"

یہ تو چور کہ چوری کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ چوری ایک حقیقت نہیں ہوتی جھوٹ ہوتی ہے۔" میں نے فلسفیانہ لہجے کی آڑ لیتے ہوئے کہا۔

چور سے پوچھنے پر یہ معلوم ہوا کہ مدعی ایک آرٹسٹ ہے، ملنگ آدمی ہے، قانون، انصاف اور سزا سے بے نیاز رہتی ہے۔ اس لیئے وہ کیس میں کوئی دلچسپی نہیں لے گا۔ چنانچہ اس آخری امید کے ٹوٹنے پر ہم قطعی مایوس ہو گئے۔ تھانیدار نے صرف بے ضرری ایک ضمنی رپورٹ لکھ لی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اٹھتے اٹھتے میں نے تھانیدار سے درخواست کی کہ آپ کم از کم چور کو اتنا ہی کہہ دیجئے کہ تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم آنی چاہیئے تھی۔ لیکن تھانیدار نے نہایت معقول جواب دیا۔ کہ یہ کام ریفارمروں کا ہے میرا نہیں۔ کیونکہ میں انصاف کی مقررہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

تھانے سے نکلے تو چور کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ بلبلا کر بولا "منکر صاحب! میں اب کیا کروں؟"

"دنیا کے نام ایک پیغام چھوڑ جایئے۔ اور خودکشی کر لیجئے۔"

یہ بات میں نے انتہائی بور ہو کر کہی تھی۔ لہٰذا چور کے دل پر کوئی اثر نہ چھوڑ سکی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جیسے میرا تعاقب کر رہا ہو۔ میں نے کئی شیلے تراشے لیکن چور کا ایمان ایک سچے خدا پر پایا ہوا ایمان تھا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اچانک چلتے چلتے خیال سوجھا کہ کسی وکیل سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ تو بے گناہوں کو بھی پھانسی چڑھوا دیتے ہیں۔ پھر ایک خالص گناہ گار کو

سزا دلوانا ان کے لیے کونسا مشکل کام ہے۔

وکیل کو سارا واقعہ سنایا گیا۔ جسے سن کر وہ بولا۔ کیس خاصا پیچیدہ ہے۔ مدعی موجود نہیں ہے۔ اس لیے فیس زیادہ لگے گی۔

چور نے کہا۔ "میری تین فیکٹریاں چل رہی ہیں۔ اس لیے فیس کی مجھے پرواہ نہیں۔ آپ مجھے صرف سزا دلوا دیجئے۔"

فیس طے ہونے کے بعد وکیل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے بھی لگا اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ نجانے ایسے خوش پوش اور باثروت آدمی چوریاں کیوں کرتے ہیں میں نے وکیل صاحب کا حوصلہ بندھایا کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ باثروت بھی اور بے ثروت بھی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد وکیل کی آنکھوں میں جیسے بلی کی سی چمک آگئی۔ مجھ سے بولا۔ "آپ اس کیس میں مدعی بن جائیے۔"

"بن جاؤں گا۔" میں نے حصول انصاف کی خاطر کہا۔

"اور آپ" اس نے چور سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک چاقو لیجئے اور اپنے ہاتھ کو زخمی کیجئے۔ اور مدعی کی گردن پر بھی ہلکا سا زخم لگائیے تاکہ میں یہ بات کہہ سکوں کہ چوری کے وقت آپ دونوں نے ایک دوسرے پر حملہ بھی کیا۔ اس شہر میں آپ کے کچھ دشمن موجود ہیں کیا؟"

"ہیں تو سہی۔"

"ٹھیک ہے، ہم انھیں آپ کی مخالفت میں بطور گواہ پیش کریں گے۔"

چور نے اداس لہجے میں کہا۔ "مگر وہ میرے خلاف گواہی نہیں دیں گے۔"

کیونکہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"خیر کوئی حرج نہیں۔ پیشہ ور گواہوں سے کام چلا لیں گے۔ پیسہ موجود ہو تو انصاف حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ اچھا اب آخر میں یہ بتا دیجیے کہ کیا آپ کے خاندان کی کسی پشت میں بھی کوئی آپ کا بزرگ چور تھا؟"

"سبھی چور تھے۔"

"ونڈرفل! کیس انتہائی مضبوط بنتا جا رہا ہے۔ اب آپ جائیے۔ میں کل نکو صاحب المعروف مدعی کی طرف سے دعویٰ دائر کر دوں گا۔ انشاء اللہ آپ کے حسب منشا آپ کو سزا ملے گی۔ نکو صاحب! آپ بطور مدعی اس کاغذ پر دستخط کر دیجیے۔"

میں نے جونہی قلم اٹھایا۔ نجانے اچانک چور کو کیا سوجھی اُس کا ضمیر جاگ پڑا۔ قلم چھین کر اُس نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور بولا "یہ نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں ہوگا کہ میں اپنے ایک مربی اور محسن کی گردن پر چاقو ماردوں۔ وکیل صاحب! میں تو سیدھا سادا انصاف چاہتا ہوں کہ ہاتھ صرف میرا کاٹا جائے کسی اور کا نہیں۔"

وکیل نے کہا "زخم دونوں کے لگیں گے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجے گی۔"

چور کا ضمیر اپنی حدود سے زیادہ جاگ چکا تھا اس لیے اپنی بات پر مصر رہا اور کہنے لگا کہ میں تو اپنے جرم کی سزا اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا سدھار ہو جائے اور سماج کو جرم سے نفرت ہو۔ وکیل صاحب نے مشورہ دیا کہ تم چوری کی بجائے کسی سوشل سدھار سبھا کے پریذیڈنٹ بن جاؤ۔ اور پھر اُس نے غصہ میں آکر اپنے سر کو ہلایا اور پھر ہم دونوں کو باہر نکلوا دیا۔ گلی کے کتے بھونکنے لگے۔ محلے کی عورتیں

کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر ہمیں دیکھنے لگیں۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے نیچے کود کر کرکٹ کا تھال پھینکتے ہوئے ہم سے ازراہِ انسانیت پوچھا۔

"ارے بھائی کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "یہ چور ہے۔"

یہ سن کر اس ادھیڑ عمر عورت نے مارے ڈر کے کھڑکی بند کر لی۔

اب ہم دونوں سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے جیسے ہر ایک، دوسرے کی ارتھی اٹھائے ہوئے، ایک دوسرے کو دفن کرنے جا رہے ہوں۔ چلتے چلتے میرا جی چاہا کہ پانی پینے کے بہانے چوری چوری کھسک جاؤں لیکن میرا ضمیر مجھ سے بھی زیادہ بزدل نکلا۔ اُس نے میری زبان میں تالا اور پاؤں میں ہتھکڑی لگا دی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی چور ہوں۔ جیسے ہم سب چور ہیں۔ اپنی اپنی خواہشوں کو خود ہی چرا کر خود ہی سے چھپائے ہوئے ہیں اور پھر اس قسم کی چوری کو ضمیر کا نام دیتے ہیں۔

چور نے کہا۔ "اجی جناب میرے ساتھ ساتھ چلیے۔"

میں نے کہا۔ "تم جہنم میں جاؤ میں گھر جاؤں گا۔"

چور اس انتہائی اور غیر متوقع پروگرام پر رونے لگا۔

میں نے اُس کے آنسوؤں سے بچنے کے لیے فوراً اُسے ایک سمجھاؤ دیا۔

"تم آج سے چوری سے توبہ کر لو۔"

وہ بولا۔ "موجودہ چوری کی سزا مل جائے تو وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گا۔ لیکن اگر سزا نہیں ملی تو مجھے پھر چوری کی ترغیب ستائے گی۔"

خدا کے لیے کچھ کرو۔"

"اگر تم کہو تو میں اٹھا کر کسی کنوئیں میں پھینک دوں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے تنگ آ چکے ہیں ۔۔۔ ہیں نا؟"

"تنگ تو آ چکا ہوں ۔۔" میں نے دل ہی دل میں کہا "نہیں، نہیں! میں تو آخر تک تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔"

"تو آؤ کچہری چل کر قسمت آزمائیں"

ایک نہایت لرزہ خیز سرد آہ بھر کر میں نے کہا ۔"چلو۔"

اندر چند منٹ بعد ہم کچہری کے احاطے میں کھڑے تھے۔ انصاف کے حقیقی دروازے پر۔ جہاں داخل ہوتے ہی پہلے انصاف کے ترازو کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی اور جہاں قاتل اور مقتول دونوں انصاف کی تلاش میں گھومتے پھرتے تھے۔

ہم کمرۂ عدالت میں یوں بے تکلفی سے گھس گئے جیسے بچہ بے محابا اپنی ماں کی جھولی میں جا گرتا ہے۔ مصنف ایک فائل پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ ہمارے پاؤں کی چاپ سنی تو اس نے گردن اٹھائی اور یوں غصے سے بولا۔ جیسے ہمیں دیکھ کر اسے اپنی بے عزتی کا احساس ہوا ہے۔

"کیا ہو تم ؟"

"جی ! یہ چور ہے اور میں ......"

اور اس سے پہلے کہ میں اور مصنف ایک دوسرے کے ذہنی طور پر قریب آتے، چور نے ایک دم چلانا شروع کر دیا۔ دہائی ہے، جج صاحب! دہائی میرا

انصاف کرو۔"

مصنف کے چہرے پر ایک بیزاری سی ابھری۔ خاموشی! شور مت مچاؤ یہ عدالت ہے۔"

"میں خاموش نہیں ہو سکتا۔ میں بولتا رہوں گا، چیختا رہوں گا ــــ اس وقت تک جب تک مجھے انصاف نہیں ملے گا۔"

مصنف نے چور سے بھی زیادہ زور سے چلا کر کہا: "عدالت تمہیں حکم دیتی ہے کہ یا تو خاموش ہو جاؤ یا کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"

"میں اب زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔ اور نہ ہی اس کمرے سے باہر نکلوں گا۔ جب تک ....."

"تم عدالت کے حکم کی توہین کر رہے ہو۔"

"ہونے دیجئے۔"

"اور تمہیں توہین عدالت کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

مصنف کا یہ حکم سنتے ہی دو سپاہی آگے بڑھے۔ چور کو ہتھکڑی لگائی اور گیٹ کے باہر لے گئے۔ اور جیل خانے میں لے جا کر بند کر دیا۔ اور میں چوری کے مال کی گٹھڑی بدستور اپنے کندھے پر رکھے کمرۂ عدالت سے باہر نکل آیا۔

ننگی عورت

جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بالکل ننگی تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے یوں لگی جیسے اسٹیو لیس اسٹیل کا ایک تازہ چمکیلا اور تیکھا شیونگ بلیڈ ہے، جس کا ریپر اُتار کر پھینک دیا گیا ہے۔

"کیا میں دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں؟" حالانکہ وہ بے حد نروس ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود لہجہ مہذبانہ تھا۔ "وہ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ سوائن۔ (سور)" مہذب لہجہ میں غصہ بھی تھا۔ شاید اس نے میری اجازت کی ضرورت نہ سمجھی، اور چٹخنی چڑھا دی، اور اطمینان کا گہرا سانس لے کر میرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نہیں جانتا اس دوران میرے صوفے پر کیا کچھ گزر گیا، کیونکہ وہ ننگے جسم کا عادی نہیں تھا۔ نہایت زاہد خشک قسم کا صوفہ تھا۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا "آپ کا ریپر کہاں ہے محترم خاتون؟"

جملہ حقوق ـــــــ غیر محفوظ
سن اشاعت ـــــــ قریب قریب ۱۹۸۳ء

تعداد اشاعت ـــــــ صیغۂ راز میں
قیمت ـــــــ بیس روپے (مہنگائی الاؤنس سمیت)

چھاپہ خانہ ـــــــ نعمانی پریس دہلی

پبلشرز
آہلووالیہ بک ڈپو
9953/4 نیو روہتک روڈ
پوسٹ بکس نمبر 2507
نئی دہلی نمبر 110005

ڈر کے مارے یا عزت بچانے کے مارے بھارت ماتا کہتے ہیں۔ اور اُن کی ہتھیلی میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر کہتے ہیں "او ماں! او بھارت ماں! تیرے انگ ہیں ننگ دھڑنگ۔ مگر پھر بھی ہم ترے سنگ!"

چنانچہ ان سہاگنوں بھاگنوں کے ساتھ عام طور پر تین چار بچے ہوتے ہیں، پانچواں زیرِ تعمیر ہوتا ہے۔ اور نہ بچے جانتے ہیں نہ سہاگن ـــــ کہ یہ کس کی تخلیق ہیں۔ کیونکہ کسی بچے کا چہرہ راجکماروں ایسا ہوتا ہے تو کوئی دُکانداروں ایسا اور کوئی بھکاریوں ایسا۔

ان کے علاوہ ان کی اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی ذائیں ہوتی ہیں۔ جو عام طور پر باہر کی ذات ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں عورت کو ہر سطح پر، ہر روپ میں ارد ھنگنی ہی مانا جاتا ہے۔

لیکن ایک تو اسے محترم کہنا آسان نہیں تھا، خواہ مخواہ قسم کا اینٹی کیٹ لگتا تھا۔ اور، دوسرے اس کے ننگے جسم اور میری آنکھوں کے درمیان جو فاصلہ تھا اسے طے کرنے کا اس نے مجھے وقت ہی نہیں دیا اور بولی " میں نہیں جانتی آپ شہر کے لوگ اتنے ولگر ہیں۔"

مگر میں اس فاصلے کو فوراً غائب کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دو ہی طریقے تھے، یا تو میں گلاب کا پھول بن کر اس کے ننگے بدن کی خوشبو پر گریوں اور اسے نذر آتشہ کر دوں اور یا کوئی وحشی اندھیرا مجھ پر جھپٹے اور مجھے اندھا کر دے، اور جس سے اس کا ننگا جسم میری آنکھوں سے ایک دم غائب ہو جائے۔

چنانچہ میں تیزی سے اٹھا اور یہ کہتے ہوئے بغل کے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔" آپ بجا فرماتی ہیں، لیکن اس میں ہلکی سی ترمیم کر لیجئے کہ صرف میرے شہر میں ہی نہیں، ہر شہر میں ولگر لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اب آپ یہاں محفوظ ہیں:.................. کیونکہ آپ یہاں میری مہمان ہیں۔" کمرے میں واپس آتے ہوئے میں اندر سے اپنی بیوی کی ایک ریشمی شال اٹھا لایا اور اس کے جسم پر پھیلا دی۔

" مجھے نہیں چاہیئے یہ شال!" اس نے وہ شال یوں نیچے پھینک دی جیسے وہ کوئی آم کا چوسا ہوا چھلکا ہو، اور اسے چوسنے کے لیے دیا گیا ہو۔

" مگر کیوں ؟" میں نے شریفانہ دلیل سے اسے قائل کرنا چاہا۔" جسم پر لباس پہننے کا رواج تو اب عام ہو گیا ہے، بلکہ کچھ لوگ تو اسے کلچرڈ فعل بھی کہنے لگے ہیں۔"

وہ مسکرادی (مسکراہٹ نیچرل نہیں تھی) "نہیں ننگے جسم میں زیادہ کلچرڈ لگتی ہوں، ایسا مجھے کلچرڈ لوگوں نے بتایا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی زلفوں کو بزم خود ایک آرٹسٹک جھٹکا دیا اور میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میری پرابلم یہ تھی کہ میں اس شعر کی داد نہیں دے سکتا تھا جس میں خواہ مخواہ ترنم استعمال کیا گیا ہو۔

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی سڈول چھاتیوں کی قوسوں کو دیکھا۔ جن میں زلفوں کے جھٹکے سے کچھ رنگ ابھرے، رنگوں میں زیر و بم سا پیدا ہوا۔ لیکن آہ! ان میں بھی قوس و قزح کا سا ترنم نہیں تھا۔ قوس و قزح صرف نیچرل ہی اچھی لگتی ہے۔

میں نے پھر اس سے کہنا چاہتا تھا کہ آپ کو شال اوڑھ لینی چاہیئے، کیونکہ آپ کا جسم (چلئے خوب صورت اور سڈول ہی سہی) اس حد تک ننگا ہو گیا ہے کہ بھونڈا لگ رہا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہہ سکا۔ کیونکہ ایک تو میں اپنے آپ کو میزبان ڈکلیر کر چکا تھا، اور دوسرے گفتگو اور حرکات سے وہ آرٹسٹ بن رہی تھی۔ عریانی اور آرٹ دونوں میری کمزوریاں ہیں۔ اس لیے میں نے اپنی بے بسی چھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے میرے غریب خانے پر زحمت کیسے گوارہ کی۔"

"کیا آپ کو میرا آنا برا لگا؟" میز پر سے اس نے میری ماچس اٹھالی، اور اس کا ایک ہوائی بوسہ لیا۔ اگرچہ بوسہ دلگیر تھا، لیکن ماچس بکس سے شعلہ ابھارنے میں ناکام رہا۔

"نہیں نہیں، اس میں کوئی برائی کی بات نہیں۔ اگر ہم دونوں کا تعارف ہو جائے؟"
میں نے اپنی ذہنی اذیت کو تکلف میں چھپا کر کہا۔

"میں بہت مشہور عورت ہوں، میرا نام آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔"
وہ گردن اکڑا کر بولی۔ ایک صراحی دار گردن اس طرح نہیں اکڑتی۔ اکڑ سے تو چارم کھو بیٹھتی ہے۔

میں نے سوچا، ممکن ہے، ننگے جسم کی اس عورت کا نام میرے لیے اجنبی نہ ہو۔ میرے ذہن میں ایک دم کئی نام ابھرے جو بڑے مشہور تھے اور میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ ایک چیف منسٹر ابھرا، ایک اسمگلر ابھرا، ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے والا شوربیر ابھرا۔ مگر چند برس بعد ان کی شہرت جیل کی ہتھکڑی پر جا کر ختم ہو گئی تھی۔

مشہور چیزوں کا کبھی کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا نام اوشا نعمان ہے، مشہور و مقبول فلم ہیروئن!" ریشمی ہونٹوں کی بلندی سے یہ نام نیچے زمین پر اترا۔

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ میرے لیے یہ نام اجنبی نہیں تھا۔ بلکہ چیف منسٹر اور اسمگلر کے پائے کا نام تھا۔ اگرچہ کوئلے اور بناسپتی گھی کی روز افزوں بلیک کے باعث مجھے فلمیں دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ لیکن میں نے یہ ضرور سن رکھا تھا کہ اوشا نعمان نے آکر تباپوش ملاؤں تک تسبیح کے دانے بکھیر دیئے ہیں اور صرف آرٹ کی خدمت کی خاطر بکھیرے ہیں۔

میں نے پھر ایٹی کیٹ کا سہارا لیا۔ "اوشا نعمان جی! میری خوش نصیبی

ہے کہ آپ اپنے نیچرل جسم کے ساتھ غریب خانے کی شان بڑھانے تشریف لائی ہیں، اور اصل آرٹسٹ جس روپ میں بھی مجھے ملے میں اس کے سامنے سربسجدہ ہو جاتا ہوں۔"

نہ جانے وہ میری نیت کا مطلب صحیح سمجھی یا غلط، لیکن یہ سن کر کچھ زیادہ بے تکلف ہو گئی اور صوفے پر اس انداز میں لیٹ گئی جسے احتیاطاً بھی دیکھو تو فحش انداز تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس انداز کو فائن ایکٹنگ کا اظہار سمجھتی ہو، یا شاید اسے یقین ہو کہ اس کا جسم اس ایکٹنگ کے ساتھ دو آتشہ ہو جائے گا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس کا جسم انتہائی خوبصورت ہے لیکن خوبصورتی جب ننگی ہو جائے تو اس کی آگ سرد ہو جاتی ہے، بجھ جاتی ہے۔

چند منٹ تک ہم دونوں کسی مشترکہ موضوع کی تلاش میں ڈوبے رہے، اور اس ڈوبنے اور ابھرنے کے وقفے میں ہم نے چند بے معنی باتیں کیں، جس سے شاید وہ بور ہو گئی۔ تکان اس کے خوبصورت جسم کو بھیانک کرنے لگی تو وہ بولی "او خدا! میں کتنی تھک گئی ہوں۔"

"آرٹ کی خدمت کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے، آپ کچھ دیر کے لیے آرام فرمائیے۔ اب لوگ یہاں نہیں آ سکتے، اور میری بیوی سو گئی ہوئی ہے، اس لیے آپ اطمینان قلب سے سو سکتی ہیں۔"

اور وہ جیسے اسے اپنا گھر سمجھ کر سو گئی۔

چند منٹ تک ایک بےحس خاموشی میرے ارد گرد گھومتی رہی اور میں اینگ اپنی دوراندیش قسم کی ذہانت کے باوجود کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اب اوشا نعمان اور میرے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ کیا اس سے میرا سوشل اسٹیٹس بڑھ گیا ہے یا مشکوک ہو گیا ہے، کہ اتنے میں کسی نے میرا دروازہ پھر کھٹکھٹایا۔ کھٹ کھٹ پھر مہذبانہ تھی۔ میں نے سوچا شاید پولیس ہوگی۔ لیکن پولیس کی کھٹ کھٹ تو اتنی مہذبانہ نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف سچویشن کی اس نئی تبدیلی کا میں نے سواگت کیا، اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

یہ سرون کمار تھا، گنگا سرن وکیل کا گریجویٹ بیٹا ـــ جو نہ جانے کیوں اپنے باپ کی گریجویٹ پریکٹس کے باوجود میری عزت کرتا تھا، شاید اس لیے کہ وہ غلط اردو اشعار بہک بہک کر سناتا تھا اور میں اعتراض نہیں کرتا تھا، بلکہ داد دیتا تھا۔ دوسرے وہ ایک کانجیسٹ لڑکی سے عشق کرتا جو گزشتہ تین برس سے بی۔ اے میں فیل ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کے نام وہ کبھی کبھی مجھ سے لو لیٹر بھی لکھوایا کرتا تھا ہمارا معاہدہ تھا کہ میں صرف لو لیٹر لکھوں گا، عشق وہ خود کرے گا۔

اس کے ساتھ ایک دوست بھی تھا، جس نے شاید اس امید پر اپنی قلمیں بڑھا رکھی تھیں کہ کوئی حسینہ اسے چھیڑ دے گی۔ مجھے نمسکار کرنے کے بعد سرون کمار بولا۔ انکل ..... انکل! ـــ ہی ہی ہی!

میں نے کہا۔ برخوردار اس ہی ہی ہی کا ترجمہ کرو۔

وہ دونوں ہتھیلیاں ایک دوسرے پر ملتے ہوئے بولا۔ "ہی ہی ہی... مطلب ہے شہر میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوشانوان آپ کے گھر تشریف لائی ہے۔"

"افواہ میں آمیزش نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو آپ بڑے اچھے انکل ہیں۔ کیا آپ ہمیں، ہی ہی ہی.... مطلب ہے اس کی ایک جھلک.... ہی ہی ہی...... ہے"

"مگر بیٹا، اس کا جسم تھکا ہوا ہے اور وہ اس وقت آرام کر رہی ہے کم از کم دو گھنٹے تک میں اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔"

"ویسٹ آل رائٹ! میں دو گھنٹے تک حاضر ہو جاؤں گا۔ ڈیڈی سے ذکر نہ کرنا ورنہ ...... ہی ہی ہی۔"

"میں اس ہی ہی ہی کا ترجمہ سمجھ گیا ــــ لیکن سنو! میں نہیں جانتا محترمہ جاگتے ہی واپسی کا سفر اختیار کر لے۔ ویسے موڈ آ جائے تو ہفتہ بھر تک میرے گھر کی زینت بن کر رہ سکتی ہیں۔"

"ہفتے بھر نہ لا محدود بہتر رہے گا" اس کے دوست نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے سر کی مصنوعی وگ بھی گر گئی۔ وگ ایک قسم کی ایکٹنگ تھی اور سر کا گنجا پن ایک حقیقت ــــ وہ یہ دھمکی دے کر چلے گئے کہ ہم دو گھنٹے تک نیچے مارکیٹ کے ہی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گزار دیں گے۔ کیونکہ وہ لوشا کے لیے دو گھنٹے تو کیا، دو جنم بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

"مگر کیوں؟ کیا تم اس پر عاشق ہو؟"

"نہیں انکل! اس نے فلموں میں اپنے ننگے جسم کا بے باکانہ مظاہرہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ یہ میرا نہیں، سماج کا ننگا پن ہے۔"

"تو تم اس کے ننگے جسم کے متوالے نہیں ہو۔"

"نہیں انکل! ہم اس کے ننگے جسم کو دیکھ کر سماج کا ننگا پن دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میں واپس اندر چلا گیا، مگر ایک منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ چھوٹے چھوٹے بچے میری کھڑکی میں سے جھانک رہے ہیں۔ جیسے طاق کی درزوں میں سے آفتابی کرنیں اندر گھستی آ رہی ہوں۔ بلکہ ایک آدھ نے تو شایستی بجا دی، جیسے پان شاپ پر ننگ تیا ہار پہنے اہل ذوق چھو کر سے بجایا کرتے ہیں۔

میں نے اپنے گھر کو پان شاپ بنانا مناسب نہ سمجھا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا، اور گرجا "شٹ اپ، کیا بات ہے؟ بھاگ جاؤ یہاں سے!"

میری گرج شاید انہیں بے معنی لگی، اس لیے انھوں نے بھاگنا غیر ضروری سمجھا، ان کے ساتھ دور کھڑی محلے کی ایک کتیا تھی وہ ضرور بھاگ گئی۔ نہ جانے اُسے اوشا نعمان میں کیا دلچسپی تھی، حالانکہ وہ کتیا خود بھی ننگی تھی اور یہ سراسر چانس کی بات تھی کہ اُسے فلموں میں کوئی رول نہیں ملا تھا۔

میں نے پھر تشریح آ دھمکی دی "تم بھاگ کیوں نہیں جاتے۔"

"چہ چہ چہ!" ان کا جواب تھا۔

"اس چہ چہ چہ کی وضاحت کرو۔" میں نے کہا۔

"اوشا نعمان!" یہ ان کی وضاحت تھی۔

"مگر وہ تو ننگی ہے بے وقوفو!"

واسی لیے تو قابل دید ہے۔" یہ کہتے کہتے سبھی بچے میرے دامن سے یوں لپٹ گئے جیسے کہہ رہے ہوں، اوں ہوں اوں۔ ہمیں مٹھائی لے دو۔

مجھے غصہ آگیا۔ اپنی اپنی ممی سے جاکر کیوں نہیں کہتے، منگی ہو جائیے۔"

ایک بچہ جو شاید ان کا لیڈر تھا۔ بول اٹھا "میری ممی کہتی تھی انکل! کہ ہم اوشاجی کو شام کی چائے پر بلائیں گے۔ اور آپ بھی اس کے ساتھ آئیں گے۔"

میں کراہ اٹھا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ میری اپنی پوزیشن بہت نازک ہو چکی ہے، اس لیے میں تمہاری ممی کی پوزیشن کو نازک نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں بچے کا نازک دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس سے کہہ دیا کہ اوشاجی کے جاتے ہی ہم دونوں آپ کی ممی، ڈیڈی اور سہیلیوں اور دوستوں کے درشن ضرور کریں گے۔

یہ سن کر بچے تالیاں بجاتے ہوئے یوں چلے گئے جیسے انھوں نے کوئی اڑتا ہوا پتنگ لوٹ لیا ہو۔ مگر ڈھائی برس کے ایک شوقین بچے نے میرے گھر کے باہر دھرنا دینے کا اعلان کر دیا، کہ میں آپ دونوں کے ساتھ ہی چائے پینے کے لیے چلوں گا۔

ان کے دھرنا دینے پر یوں لگا جیسے پوزیشن میرے ہاتھ سے نکل گئی ہو۔ اور ان کے ہاتھ میں چلی گئی ہو۔ اور میں آرٹ اور سماج کے درمیان بری طرح سینڈوچ ہو رہا ہوں۔ خیریت اسی میں ہے کہ میں درمیان سے نکل جاؤں چنانچہ ان سے میں یہ کہہ کر کہ پتا جی کی تلاش میں ذرا مارکیٹ جا رہا ہوں دروازے کو تالا لگا دیا۔

چوک میں شری جوگا رام جی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ علاقے بھر میں سماج واد

لانے اور بناسپتی کو دیسی گھی میں بدلنے کے بڑے ایکسپرٹ مانے جاتے تھے۔ ان کے ہمراہ تین چار درباری تھے۔ جے گا رام بولا، "فکر صاحب! سنا ہے آپ کے گھر میں ادشا نعمان آئی ہوئی ہے۔"

"ہاں، لیکن میں تو بناسپتی گھی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"اجی، آپ اس خاکسار کو حکم دیجئے۔ بناسپتی گھی چھوڑ، دیسی گھی کا پیپہ راتین آپ کے گھر حاضر ہو جائے گا۔ جس گھر میں اتنی بڑی آرٹسٹ آسکتی ہو، کیا اس گھر میں گھی کا ٹین نہیں آسکتا۔"

"کیا وہ واقعی بہت بڑی آرٹسٹ ہے!" میں نے پوچھا۔

"اجی، تہلکہ مچا دیا ہے۔ فلموں پر ایٹم بم کی طرح گری ہے۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں گھی کا ٹین لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ بس ذرا اس ایٹم بم سے خاکسار کا تعارف کرا دیجئے گا۔"

ڈھائی سالہ مداح اور جے گا رام دونوں مجھے برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے، اور میں اپنی بربادی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

محلے کی مارکیٹ سے گزرتے گزرتے کئی حضرات نے مجھے جھک کر سلام کئے۔ راج سنگھ حلوائی نے، شام ناتھ پراپرٹی ڈیلر نے، دولت رام اسکول ماسٹر نے جو ۲۵ برس سے اپنا کنوارپن نبھائے جا رہا تھا۔ کالج کی پانچ چھ لڑکیاں ایک مندر کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں تاکہ ان کا امتحانی پیپر، گیس پیپر کی نقل بن جائے۔ انہوں نے مندر کو چھوڑ کر میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کی۔ پان شاپ کے لفنگوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہی ہے وہ شخص جس کے گھر میں ادشا نعمان آئی ہوئی ہے۔ ہم نہیں جانتے تھے، یہ اتنا عظیم شخص ہے۔ کچھ بیا تھا اور کچھ لو بیا تھا

عورتوں نے اپنی اپنی بالکونی سے مجھے یوں دیکھا جیسے مجھ پر پشپ ورشا کر رہی ہوں۔ غرض .....

..... غرض اوشا نعمان کے آنے سے محلے بھر میں میری عزت بڑھ گئی۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے اپنی عزت بڑھانے کے جتنے جتن کئے تھے وہ بھی فیل ہو گئے تھے۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میرا ایک قدم کئی فٹ بڑھ گیا ہے، اور میں آسمان کی لامحدود بلندیوں کی طرف اڑا جا رہا ہوں۔ اور اوشا نعمان میرے کندھے پر بیٹھی ہے۔ اور نیچے آنے والے پیڑ سے سماج پر قہقہے لگا رہی ہے۔

جب میں گھر لوٹا تو دھرنا دینے والا بچہ تکان کے باعث سو گیا تھا، اور موٹے تالے کے ساتھ ٹیک لگائے دو معززین یوں کھڑے تھے جیسے تالے پر رال ٹپکا رہے ہوں ـــ ان میں سے ایک محلہ سدھار کمیٹی کا پریذیڈنٹ تھا اور دوسرا سلکی ململ زیب تن کئے کوئی پہلوان قسم کا آدمی تھا۔ میں انہیں دیکھتے ہی کہنا چاہتا تھا "صاحبان! کیا آپ بھی اوشا نعمان کی وجہ سے میری عزت بڑھانے آئے ہیں؟ اور مجھے محلہ سدھار کمیٹی کا پریذیڈنٹ بنانا چاہتے ہیں؟"

مگر میرے کہنے سے پہلے ہی پریذیڈنٹ بول اٹھا۔ (لہجہ غیر شریفانہ تھا)

"فکر صاحب! اگر آپ ایک منٹ اور نہ آتے تو ہم یہ تالا توڑ کر اندر داخل ہو چکے ہوتے۔"

"تالے کی قسمت اچھی تھی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"خاموش! (یعنی شٹ اپ) کیا یہ صحیح ہے آپ کے گھر میں ایک ننگی فلم ایکٹریس آ کر ٹھہری ہوئی ہے، جس سے محلے بھر کا اخلاق خطرے میں پڑ گیا ہے۔"

میرے گھر کے جانور

آج میں آپ کو ماضی کی طرف لے چلوں گا۔ جو حسین ہوتا ہے۔ گھبرائیے نہیں، ہم جو آج کے بھونڈے انسان ہیں، کل ہم بھی حسین ہی لگیں گے۔

میں اُن دنوں اپنے گاؤں میں رہتا تھا اور اس لیے رہتا تھا کیونکہ سُنا تھا، ہندوستان گاؤں ہی میں رہتا ہے۔ چنانچہ میرے گھر میں پورا ہندوستان رہتا تھا۔ جن میں کچھ مخلوقات تھی کچھ اشرف المخلوقات ـــــ اشرف المخلوقات میں گھر کے سبھی افراد شامل تھے۔ جنھیں بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ ہم اُتنے اشرف نہیں ہیں جتنا ہمیں سمجھ کر بھیجا گیا ہے۔

اور مخلوقات؟ گھر کے اُن جانوروں پر مشتمل تھی۔ جو انسانوں کے بغیر یتیم لگتے تھے بلکہ میرے گھر میں انسان بھی وہی رہتے تھے جو جانوروں کے بغیر اشرف المخلوقات نہیں لگتے تھے۔ جن جانوروں کی جنگل میں شیر، بھیڑیئے اور چیتے وغیرہ سے ہیں

"مگر وہ تو ....." میں نے کہنا چاہا۔

"بکواس بند کرو۔ تالہ کھولو۔ ابھی دیکھی آپ کو اپنا حشر معلوم ہو جائے گا۔"

پہلوان نے مجھے ہٹتا نہ سمجھ کر ڈنکا لہرایا۔

اور میں نے اپنا حشر دیکھنے کے لئے تھرتھراتے ہاتھوں سے تالہ کھول دیا اور محلے کا پورا اخلاق اندر داخل ہو گیا۔ لیکن آہ! ملکہ داہ! اوشا نعمان وہاں سے غائب تھی۔ نہ اس کا ننگا جسم تھا نہ آرٹ۔

اور جب دوسرے دن میں اس ٹوٹے پھوٹے ٹرک کے پچھواڑے سے گزرا جہاں اسے ہر روز ننگ دھڑنگ بھیک مانگتے دیکھا کرتا تھا تو اوشا نعمان وہاں سے بھی غائب تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ایک مونچھیں کانسٹیبل اسے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ میں لپک کر اس کانسٹیبل کے پاس گیا اور کہا۔

"سنتری جی! بے چاری کو کیوں گھسیٹے لے جا رہے ہو۔ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھر رہی تھی۔"

کانسٹیبل نے اس کے ننگے جوان جسم پر پوٹ کی ٹھوکر لگائی اور بولا: "اجی کپڑے پہن کر روزی کمائے کون روکتا ہے۔ لیکن پبلک کے سامنے ننگی ہو کر روزی کمانا تو جرم ہے۔ اس کا پیٹ بھرتا رہے اور سماج کا اخلاق بگڑتا رہے۔"

مجھے قتل کر دو!

"کیا آپ اتنی زحمت گوارا کر سکتے ہیں کہ مجھے قتل کر دیں؟"

اس کے لہجے میں بے ساختگی تھی، مگر عجیب بات تھی کہ وہ دیانت دارانہ بے ساختگی لگتی تھی، جو آج کل کے زمانے میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بیساختگی تو آج کل صرف ایکٹنگ ہو کر رہ گئی ہے۔

مجبوراً میں نے بھی دیانت داری سے جواب دیا۔ "دیکھئے قتل کرنا میری ہابی نہیں ہے۔ لیکن اس محلے کے آخر کار سے پر ایک شخص شیر سنگھ نامی رہتا ہے۔ وہ اس معاملے میں آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ بڑی فراخ دلی سے قتل کر دے گا۔"

میری تجویز سن کر وہ کچھ اداس ہو گیا۔ شاید اس نے سمجھا کہ میں اسے ٹرخا رہا ہوں۔ پانچ چھ سیکنڈ تک اس پر بوجھل سی خاموشی طاری رہی، اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "ہر آدمی مجھے بھکاری سمجھ کر دوسرے کا دروازہ دکھا دیتا

ہے اور کہتا ہے، بابا معاف کرو۔ کوئی بھی قتل نہیں کرتا۔ شیر سنگھ بھی آپ بھی۔۔۔۔۔۔"

لگتا تھا، وہ شیر سنگھ کو آزما چکا ہے۔ مجھے شیر سنگھ سے ایسی سنگدلی کی توقع نہیں تھی۔ نہ تو ہر منگلوار کو برت رکھا کرتا تھا، خدا ترس تھا

جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو یوں گھبرایا ہوا تھا جیسے یا تو وہ خود چور ہے یا چور کا تعاقب کرنے والا پولیس مین ہے ــــ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے چٹخنی چڑھا دی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ چٹخنی ایک ادیب کی ہے، لہٰذا ٹوٹی ہوئی ہے۔ مگر آپ اسے کیوں بند کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ چور ہیں تو آپ کو کسی نے غلط مکان کا ایڈریس دیا ہے۔ اس گھر میں انسان کے دکھ سکھ کے جذبات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔"

مگر اس نے میرے اس نفیس بیان پر توجہ نہیں دی، بلکہ سیریس ہو کر بولا۔ "یہ دنیا۔۔۔۔ میں تمہاری دنیا سے ڈرتا ہوں، وہ اندر گھس آئے گی، اور مجھے کسی انعام یافتہ کتے کی طرح گھسیٹ کر لے جائے گی، اور پھر میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دے گی اور نعرے لگائے گی، زندہ باد زندہ باد۔۔۔۔!"

اس کا قد معقول تھا، لباس معقول تھا، ناک نقشہ معقول تھا۔ لب و لہجہ معقول تھا۔ بہت سی معقولیتیں ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں تو کچھ معقول نہیں لگتیں۔ لیکن وہ بے حد جاذب نظر تھا، پرکشش تھا۔ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جن کے مساموں میں مقناطیس بھرا ہوتا ہے وہ آپ کی روح کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ آپ کے وجود کا

سارا زہر چوس لیتے ہیں اور پھر آپ بے بس ہو کر ان مساموں میں سانس لینے لگتے ہیں۔

اس کے لئے جب اس نے بڑے نرم اور نفیس لہجے میں کہا: "مجھے قتل کر دو" تو مجھے یوں لگا: جیسے یہ انسانیت کی پکار ہے، اور مجھے شاک لگا ---- کیا انسانیت کا روپ اتنا بھونڈا بھی ہوتا ہے۔ انسانیت سے بڑھ کر تو کوئی شیطانی چیز نہیں۔ یہ کیسی انسانیت ہے کہ میں جس کے مساموں میں سانس لے رہا ہوں، وہ میرے ہی ہاتھوں مرنے کو ترجیح دے رہا ہے، چنانچہ میں نے اسے صاف کہہ دیا۔ "ویری سوری مسٹر! قتل کرنا میری ہابی نہیں ہے، البتہ شیر سنگھ ......"

اور جب وہ خلوص دل سے سسکیاں بھر رہا تھا تو میں اس کے پچاس برس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے رونا نہیں چاہیئے چاہے اس کے آنسو کتنے ہی خوبصورت ہوں۔ وہ روتے ہوئے ایک یتیم اور بے بس بچہ لگتا تھا۔ حالانکہ اس میں اتنی جاذبیت ہے کہ کوئی بھی حسین لڑکی اس سے عشق بآسانی کر سکتی ہے۔ حسین لڑکیوں کو آج کل ایسے معقول عاشق کہاں ملتے ہیں؟

میں نے فرطِ محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھئے مسٹر! قتل ہونے کے لئے بھی انسان کو بہادرانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس لئے سسکیاں بند کر دیجئے اور بتائیے کہ آپ کیوں قتل ہونا چاہتے ہیں؟"

مگر وہ بدستور سسکیاں بھرے گیا۔ البتہ اس مرتبہ سسکیوں میں ہلکا سا

مفہوم پیدا ہو رہا تھا۔

"کیا آپ دیش بھگت ہیں، اور دیش کے نام پہ شہید ہونا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

—— (سسکیاں —— تھوڑا سا مزید مفہوم)

"کیا آپ جنگی ہیرو بننا چاہتے ہیں؟"

—— (سسکیاں)

"کیا آپ ہسٹری میں نام پیدا کرنا چاہتے ہیں —— ؟"

(سسکیاں .....)

"کیا آپ قتل ہو کر کوئی ثواب کمانا چاہتے ہیں؟"

(پھر سسکیاں —— مفہوم دھندلا ہونا شروع ہو گیا۔

نہ نظریاتی تصادم، نہ مذہبی دنگا، نہ دیش بھگتی، نہ ثواب دارین!

—— یہ کس طرح کی سسکیاں ہیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے بے قرار ہو کر اس کا کندھا زور سے جھنجھوڑ دیا اور پوچھا۔ "سنو مسٹر! میں تمہیں اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا۔ جب تک وجہ نہیں بتاؤ گے۔ بنی نوع انسان نے ہسٹری میں جتنے قتل کیے ہیں ان کی کوئی نہ کوئی معقول یا نامعقول وجہ ضرور رہی ہے۔ لیکن تم نہ معقول ہو نہ نامعقول —— آخر تم کیا ہو؟"

وہ غبی طالب علم کی طرح اٹک اٹک کر بولا "میں ایک بدنصیب انسان ہوں۔"

" تو یوں کیوں نہیں کہتے، میرے بھائی ہو۔"

" خدا کے لیئے مجھ سے مذاق مت کیجئے۔ میں واقعی بدنصیب ہوں "

" بدنصیبی کوئی مذاق نہیں ہے، کیونکہ یہ عام پائی جاتی ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟

وہ پل بھر کے لیئے خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا، شاید اپنا نام تلاش کرنے کے لیئے، پھر بولا " ہائے، ساری بدنصیبی تو اس نام میں ہے۔ میں اس نام کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتا ہوں، لیکن اسے کیسے مٹاؤں؟"

" کوئی دوسرا نام رکھ لیجئے۔ پہلا نام صفحۂ ہستی سے خود بخود مٹ جائے گا "

" مجھے کوئی دوسرا نام بھی نہیں رکھنے دیتا۔ آپ میرے ذہنی کرب کو کیوں نہیں سمجھتے۔"

لیکن میں اپنی ناسمجھی کا اعتراف کیوں کرتا، پوچھا " میرے خیال میں آپ کو کوئی متعدی مرض ہے۔ خونی بواسیر؟ کینسر؟ بلڈ پریشر؟"

" کاش مجھے یہ سب بیماریاں ہو جاتیں "

اس مرتبہ اس کے بجائے میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ میری شکست کا اعتراف تھا۔

اور شاید میری شکست پر وہ خاموش ہو گیا، اور میرے کندھے پر بے تکلفانہ ہاتھ مار کر بولا " اچھا یہ بتایئے اگر کوئی شخص گذشتہ گیارہ برس سے اپنی بیوی کا بوسہ نہ لے سکا ہو، تو......"

میں نے فوراً بات کاٹ دی " وہ خوش نصیب ہے۔ بیوی کا بوسہ تو بے حد باسی ہوتا ہے اس سے بچنا چاہیئے اس کے بجائے تو ایک تازہ رسیلی گنڈیری

چوس لینا بہتر ہے۔"

اس نے منہ بنایا، شاید اسے گنڈیریاں پسند نہیں تھیں، بولا "آپ پھر نہیں سمجھے، میرا مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں مجھے کرنے نہیں دیا جاتا۔"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نکڑ کے قبیصو پنواڑی کی دوکان پر خود جا کر اس سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے کرارے پتے کا ایک پان بنا دو۔"

"پھر؟"

"پھر میں اسے اپنی آنکھ سے کتھا چونا لگاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے آئینے میں دیکھ کر اپنی نکٹائی ٹھیک کرنا چاہتا ہوں مگر وہ مجھے نہیں کرنے دیتے۔ مجھے اس آزادی سے محروم رکھ کر میرے ہاتھ میں بنا بنایا پان تھما دیتے ہیں، جیسے وہ پان نہ ہو مرا ہوا چوہا ہو —— کمینے! رذیل!"

مجھے ہنسنا چاہیے تھا ——

لیکن وہ بہت سیریس تھا۔ گالی اس کے منہ میں نامانوس سی لگتی تھی۔ صرف پان، نکٹائی اور باسی بوسے کی خاطر قتل ہوتا؟ —— کیا ان معمولی باتوں پر میں اس کی گردن اڑا دوں۔ کتنی شرمناک بات ہے؟ معمولی معمولی باتوں پر گردن اڑانا تو بادشاہوں کا کام ہے، اور میں خدا کے فضل سے انسان ہوں۔

"مگر جناب! آپ کی محرومیاں بے حد معمولی ہیں۔"

وہ بھڑک اٹھا۔ "کیونکہ آپ کو میسر ہیں، اس دنیا کے سارے انسانوں کو

میسر ہیں۔ جب میں اپنے پائیں باغ میں بیٹھا کوئل کا نغمہ سننے میں مصروف ہوتا ہوں، وہ مجھے بھی اچانک حکم دیتے ہیں۔ چلئے، سیٹھ بانکے لال کی کوٹھی میں ڈنر شیل پر آپ کا شدید انتظار ہو رہا ہے شہر کی منتخب حسینائیں آپ کے بغیر لقمہ توڑنے کو تیار نہیں ـــــ ایسی دردناک حالت میں آپ ہوتے تو کیا کرتے؟ کوئل یا ڈنر؟"

میں نے جھٹ کہا "ڈنر ـــــ کیونکہ اس سے سماج میں میری عزت بڑھ جاتی۔ شہر کی معزز حسین کنواریاں مجھ پر رال ٹپکائیں ـــــ کوئل کی کوکو سے مجھے کیا فائدہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ہجر پر ایک غزل لکھ ڈالتا۔ مگر فقط غزل سے نہ عزت بڑھتی ہے نہ پیٹ بھرتا ہے۔ غزل پر تو کوئی حسینہ مسکرا کر ایک مونگ پھلی تک پیش نہیں کرتی۔"

میرا اندازہ تھا کہ ہم دونوں کے نقطۂ نگاہ میں کافی اختلافات ہیں۔ اس کی داستان میں جو غم پنہاں تھا، اس سے میرے اندر رحم پیدا نہیں ہو سکا۔ اگر وہ پسکیاں نہ بھرتا، اگر اس کی لمبی لمبی متوالی پلکوں والی آنکھوں میں اداسی نہ ہوتی، اگر اس کے لہجے میں حسن کا درد نہ ہوتا، اگر وہ مقناطیسی خدوخال کا مالک نہ ہوتا، تو میں جھٹ کہہ دیتا "تم فراڈ ہو، ایکٹنگ کر رہے ہو، اور آج کل ایکٹنگ کوئی سچا فن نہیں رہا۔"

اس نے حقارت کے انداز میں پھر کہا "مجھے پیدل چلنے نہیں دیا جاتا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا "سالے تمہارے پاس کار ہوگی۔ بلکہ کاریں ہونگی۔"

"ہزاروں آدمی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں مگر مجھے صرف ان لوگوں سے ملنے

دیا جاتا ہے جن سے میں ملنا نہیں چاہتا ــــ" وہ کہے جا رہا تھا۔

ــــ یہ ضرور کوئی لیڈر ہوگا، کوئی بڑا افسر کوئی وزیر ــــ بے چارا!

"صبح جاگتے ہی دن بھر کا شیڈولڈ پروگرام کا بے جان کاغذ میرے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ فلاں وقت قبرستان میں جانا، فلاں وقت جشنِ قوالی میں۔ فلاں وقت مچھر مار اسکیم کا افتتاح کرنا، فلاں وقت پھولوں کے ہار پہننا، فلاں وقت خدا کی عبادت، فلاں وقت .. .. .."

میں نے کہا ــ خدا سے آپ کے تعلقات کافی خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسے اس وقت ضرور موجود رہنا پڑتا ہے، جب آپ کی عبادت کا وقت مقرر ہو۔ آپ نے تو خدا کو بھی اپنے شیڈولڈ پروگرام کے تابع کر رکھا ہے۔ آپ واقعی گریٹ آدمی ہیں۔"

میری بات سن کر گریٹ آدمی زار و قطار رونے لگا۔

اب میری حالت ناگفتہ بہ ہوگئی ــــ کئی انسان حسنِ اتفاق سے ایسے نکل آتے ہیں جن سے آپ پیار کرتے ہیں، ان کے جذبوں کی دنیا میں سانس لیتے ہیں ــــ اور میں بھی نہ جانے کیوں اس گریٹ آدمی کے جذبوں میں سانس لینے لگا تھا۔ مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کہ اگر اس کی تمناؤں پر کوئی آنچ آئی تو اس سے میری روح جھلس جائے گی۔

میں ایک پل کے لیے بھی اسے دکھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ میری تمناؤں میں سما چکا تھا۔

میں ایسے پیارے شخص کو کیسے قتل کر سکتا تھا۔

مگر ـــــ کیا ایسا سوچ کر میں اس کی تمناؤں کو مجروح نہیں کر رہا تھا۔ کیا میری محبت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ میں اس کی آرزوؤں کی تکمیل کروں؟ اسے قتل کر دوں ـــــ اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسی لہرا رہی ہے، اس کی پیاری پیاری شخصیت کراہ رہی ہے کہیں اس کے ساتھ میرے جذبے بھی کراہنے نہ لگیں ـــــ اوہ خدا! میری حالت کتنی دگرگوں کر دی ہے اس شخص نے۔

"کیا میں اس در سے خالی ہاتھ لوٹ جاؤں؟" وہ اپنی حسین جاذبیت کے ساتھ بھیک مانگ رہا تھا۔

سر سے پاؤں تک میں لرز اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت سی سانسیں میں نے اپنے حلق نگل لی ہوں، اور وہ میرے اندر جا کر لہو کی بوٹیاں بن گئی ہوں میں نے بے قرار ہو کر کہا۔

"کیا آپ اپنا قتل کل تک ملتوی کر سکتے ہیں؟"

"نہیں، نہیں، نہیں ـــــ اب پانی سر سے گزر چکا ہے، کیونکہ اب دنیا دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک حصہ میری بے پناہ عزت کرتا ہے اور ایک بے پناہ نفرت کرتا ہے ـــــ اور دونوں جھوٹ بولتے ہیں۔ میں ان دونوں کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میں چونک سا پڑا۔ "آپ سے کوئی بھی نفرت نہیں کر سکتا، آپ غلط بیانی کر رہے ہیں۔"

وہ تڑپ اٹھا۔ جیسے مرغ کو ذبح کر کے زمین پر پھڑکنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ "خدا کے لیئے ایسا مت کہیئے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے اس عزت

نبھ سکی وہ انسان کے ساتھ آبسے اور شرفا کہلائے۔ مثلاً بلی، چوہے، کتا، چڑیاں، گائے، بکری بھینس ـــ اور کبھی کبھی کوئی سور بھی دوسرے سوروں سے دڑ کر ہمارے برآمدے میں آجاتا اور اپنے آپ کو انڈر گراؤنڈ سمجھ کر وہاں بیٹھ جاتا۔

گاؤں میں انسان اور جانور دونوں ایک دوسرے کی صحبت میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ کبھی کبھی دونوں میں شناخت بھی مشکل ہو جاتی کہ ان میں گدھا کون ہے اور گدھے کا مالک کون؟ اگر کبھی کوئی انسان بھونکنے لگتا تو کتا اس کی طرف تھوتھنی اٹھا کر پوچھتا "مجھ سے کچھ ارشاد ہوا؟" اور اگر بکری آنکھیں بند کئے مراقبے میں نظر آتی تو مسجد کے مولوی کریم بخش صاحب رک جاتے اور فرماتے۔ "السلام علیکم"

ایک دن میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ جانور ہم انسانوں میں کیوں آگئے؟

وہ بولے "بیٹا یہ آواگون ہے"

میں نے وضاحت چاہی تو فرمانے لگے "ہو سکتا ہے یہ ہمارے گھر کے پشو پنچھی، سابقہ جنم میں انسان ہوں اور اسی گھر میں رہتے ہوں۔ اور پھر دیوار پر بیٹھے ایک کوے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "ممکن ہے، یہ تمہارے مرحوم دادا صاحب ہوں۔"

مجھے یاد ہے ایک دن یہی دادا صاحب اپنی پڑپوتی کے ہاتھ سے بسکٹ چھین کر بھاگ گئے تھے۔

ہمارے گھر میں ایک بلی قیام پذیر تھی۔ گھر کے تمام جانوروں سے

سے نفرت ہے جس سے لوگ خوف کھائیں۔ وہ مجھ سے نفرت کر کے لذت اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ میں ایک بے معنی انسان ہو گیا ہوں۔ خواہ مخواہ جیئے جا رہا ہوں۔"

اس کی باتیں تباکن تھیں۔

"دیکھیے، اگر آپ اتنے پریشان ہیں تو خودکشی کر لیجیے، مجھ سے یہ تھرڈ ریٹ گناہ کیوں کروانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"دریا، کنواں، ریلوے لائن ــــ وہ مجھے کہیں نہیں جانے دیتے۔ میرے چاروں طرف قدغن ہے، میرا ایک ایک سانس ان کے قبضے میں ہے، اور ستم یہ کہ وہ میرے ہر سانس کے سامنے سجدے کرتے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ انہوں نے مجھے ملک کا سب سے بڑا اعزاز "ستارۂ وطن" دے دیا۔ سن رہے ہیں آپ؟ ستارۂ وطن ..... قہ قہ قہ۔" وہ قہقہہ لگانے لگا۔

کوئی معقول وجہ ہوگی؟"

"ہوگی ــــ میں نہیں سمجھتا۔ کہنے لگے، آپ کی محنت، ذہانت، شرافت، دولت، تجارت، سیاست، نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے کہ ان کی بدولت آپ نے ملک کی بے حد خدمت کی ہے۔ مگر یہ سب بکواس ہے۔ یہ خطاب دے کر وہ مجھے اپنے پنجے میں اور زیادہ جکڑ لینا چاہتے ہیں، تاکہ میں ان کی رضا سے ہر حرکت کروں، اپنی رضا سے نہیں۔ میں نے کہا نا ــــ میں نے اپنی انا سے گیارہ برس تک اپنی بیوی کا بوسہ نہیں لیا ــــ سن رہے ہیں آپ؟"

میں سن رہا تھا، اور اسے قتل کرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔
اور اس خطا پر شدید جھگڑے شروع ہو گئے۔ قتل و خون، سر پھٹول۔
وہ بدستور بولتا گیا۔ "مگر میں کچھ نہیں چاہتا، صرف نارمل انسان رہنا چاہتا ہوں۔ نہیں تو قتل ہو جانا چاہتا ہوں۔"
اور زخمی مرغی جیسے آخری بار پھڑکی۔
اور میں نے اسے عذاب سے نجات دلانے کا آخری فیصلہ کر لیا۔
اور دوسرے لمحے خنجر اس کے پار ہو چکا تھا۔
صبح کے اخبارات میں اس کی لاش کا فوٹو چھپا۔ نیچے لکھا تھا۔ "نفسیات کے پروفیسر ہاشم کی لاش گندے نالے کے پاس۔ پروفیسر مذکور کو بڑا آدمی بننے کا بڑا شوق تھا۔ یہ تحقیق کی جا رہی ہے کہ ان کا دشمن کون تھا، یا یہ خودکشی کا کیس ہے۔"

جانوروں کے نام لَو لیٹر

ہم انسانوں کا پاپولر نعرہ ہے ——
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا!

لیکن طوطے اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا تجربہ قطعی مختلف ہے۔ کئی انسان پڑھ لکھ کر بھی حیوانیت برتتے ہیں —— اور میرا خیال انسان اور جانور دونوں سے مختلف ہے۔ وہ ان بنیادی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے بغیر اپنے آپ کو یتیم سمجھتے ہیں۔

آج میں حیوانوں کے نام چند محبت نامے تحریر کر رہا ہوں، اُمید ہے وہ انہیں رفیقانہ سپرٹ میں لیں گے، بُرا نہ مانیں گے۔ کیونکہ احباب میں اختلافات کے باوجود بے تکلفی چلتی رہتی ہے۔

بھینس کے نام ———— ۰

محترم خاتون!

آج جب میں جنتا ڈیری فارم پر گیا تو پروپرائٹر گھاسی رام خلافِ توقع فرش پر چٹائی بچھائے بیٹھا تھا اور پانچ چھ ماتم پُرسی میں مصروف تھے۔ معلوم ہوا کہ اُس کی مقبول و معتبر بھینس کل رات رسہ تڑا کر فرار ہو گئی ہے۔ گھاسی رام نے ماتھے پر دوہتڑ مار کر بتایا کہ اُس بھینس سے میرے تعلقات بہت خوشگوار تھے اور میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی ناخلف نکلے گی۔ اگرچہ کچھ دنوں سے مجھے ہلکا ہلکا شک ہو رہا تھا کہ اُس کی حرکات و سکنات غیر فطری ہو رہی ہیں۔ یقیناً میرے کسی بدطینت دشمن نے اُسے بہکا دیا تھا۔ مثلاً اُس میں دیانت داری کی خصلت پیدا ہو رہی تھی۔ جو ہمارے ڈیری فارم کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی۔ میں جب بھی بالٹی میں (رواجاً) ڈیڑھ دو کلو پانی بھر کر اس میں دودھ دوہنے لگتا تو وہ مجھ پر شو کرتی تھی۔ ایک آدھ بار تو اُس نے سینگ مار کر بالٹی مع پانی فرش پر گرا دی اور کل شام تو اس کی بدنیتی کلائمکس پر پہنچ گئی۔ اُس نے پورے کا پورا دودھ تھنوں میں چڑھا لیا۔ ایک بوند تک نیچے نہیں اُترنے دی۔ جیسے یہ دودھ اُس کے باپ دادا کا مال ہو۔ اپنے گاہکوں کے ساتھ اُس کی یہ بدسلوکی مجھے اچھی نہ لگی، اور بھائیو! بُرا نہ ماننا۔ اگرچہ پشو بھی ہماری طرح جیو جنتو ہوتے ہیں لیکن

ہیں بطور اشرف المخلوق مشتعل ہو گیا اور اس کے خود غرض تھنوں پر ڈنڈا رسید کر دیا اور کہا ــــ "اب بولو گیا گھتی ہو، ڈنڈے کے ذریعے آداب عرض قبول کرو گی یا شرفاء کی طرح؟" صاحب یہ میری ساکھ کا سوال تھا۔ اسی ساکھ کی بدولت تو گزشتہ دنوں مجھے محلہ سدھار کمیٹی کا پریذیڈنٹ بنا دیا گیا تھا۔

محترم خاتون تمہارا انکار ایک ماتم سخت تھا۔ اس لیے میں نے محلہ سدھار کمیٹی کے معتزز پریذیڈنٹ کے سامنے ادا کر دیا۔ مگر تم نے جو راہ بغاوت اختیار کی، وہ بھی شرفاء کو زیب نہیں دیتی۔ تم ایک بھینس ہو، اس لیے تمہیں اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بھلا بھینس کا جذبوں سے کیا تعلق؟ زمانے میں ایک نئی کیفیتی تبدیلی آگئی ہے۔ اتنی تبدیلی کہ تم خدا کا شکر ادا کرو کہ گھاسی رام لیس مانندو ہے، دودھ میں پانی ملاتا ہے، حالانکہ زمانہ تو اتنا ایڈوانس کر گیا ہے کہ پانی میں اچھا لگا چند قطرے دودھ کے ملا دیتا ہے۔ چلو مان لیا۔ اس کے ناپ تول کے پیمانے میں گڑبڑ ہے۔ چلو یہ بھی مان لو کہ وہ کا بک کا برتن جھاگ سے لبریز کر دیتا ہے۔ جس سے گھر میں جا کر ایک کلو کا آٹھ سو گرام رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ تو بزنس کی سائنس ہے محترم لیڈی! تم بھینس ہو، سائنس گر کچھ بیٹا نہیں ہو۔ سائنس تو عقل مندوں کے لیے ہوتی ہے اور عقل ہی بڑی ہوتی ہے، بھینس نہیں۔ کیا تم عقل مند ہو کر اپنے آپ سے بھی بڑی ہو جانا چاہتی ہو؟

میری مانو، لوٹ آؤ۔ انسانوں کے منہ آنے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ وہ اشرف المخلوق ہے۔ روکھی سوکھی گھاس، بھوسہ، کھلی، ڈنڈے جو کچھ ملے

انسان کی نوازشوں سے ملتا ہے، اُس پر گزارا وقات بھی کرتی رہو۔ اپنے پانی سے دودھ کو نفرت کی نگاہ سے مت دیکھو کہ یہی انسان کے نصیب میں ہے۔ اسے پانی مت سمجھو، مہنگائی الاؤنس سمجھو! اور لوٹ آؤ۔ جنگلوں میں آوارہ ہو کر مت بھٹکتی پھرو۔ انسانوں کی صحبت میں آ کر رہو کہ اسی سے ہی تم میں انسانیت آئے گی۔ آ جاؤ کہ تمہارا کٹا اب دوسری بھینسوں کو دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ گھاسی رام کی خاطر نہ سہی، اپنے فرزند ارجمند کٹے کی خاطر ہی لوٹ آؤ!

گدھے کے نام ـــــ

میرے بچھڑے ہوئے بھائی جان!

کل جب تم میرے گھر کے سامنے سے کھاد کے بورے پیٹھ پر لادے ہوئے گزر رہے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا سے بہت بور ہو رہے ہو۔ اگرچہ تمہارے ڈرائیور کی حالت بھی تم سے کچھ بہتر نہ تھی۔ لیکن تمہاری صحت تو کافی ڈاؤن ہو چلی ہی تھی۔ تمہاری ہڈیوں اور ڈرائیور کی ہڈیوں، تمہارے چیتھڑوں اور ڈرائیور کے چیتھڑوں میں بس نازک سے تکلف کا فرق یہ تھا کہ وہ انسان تھا اور تم گدھے تھے۔ یہ فرق اس وقت تو بالکل مٹ گیا جب کھاد کا بورا سرمئی بنگلے کے اس لال چقندر مالک نے خریدا جو کھاد کے رنگ کا سرمئی اور سلکی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس وقت تمہارا اور ڈرائیور کا شجرۂ نسب بالکل ایک سا معلوم ہوتا تھا ـــــ سلکی لباس کا شجرۂ نسب کافی مختلف تھا۔

خیر تمہیں یہ نازک فرق سمجھانا میری حماقت ہے۔ کیونکہ تم انشاء اللہ گدھے ہو۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ تمہاری سماجی پستی دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا۔ کیوں کہ ماضی میں تم اتنے پست کبھی نہ ہوئے تھے۔ اس دن تم کھاد لادے پھرتے تھے۔ جبکہ ایک مہینہ پہلے میں نے تمہیں کمہار کے گھڑے صراحیاں اٹھائے دیکھا تھا۔ تمہیں تو خیر اس کا احساس نہ ہوا ہوگا کہ نہ کھاد خالص تھی نہ صراحیاں جینوئن تھیں۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اتنی تیزی سے اپنے مالک کو کیوں بدل رہے ہو۔ کیا کمہار نے تمہیں غیر ضروری سمجھ کر نوکری سے نکال دیا ہے ——؟ یہ صحیح ہے کہ تم ایک پچھڑی ہوئی ٹرانسپورٹ سروس ہو اور یہ مشینی زمانہ ہے۔ دھوبی تک ٹیمپو پر کپڑے لادے پھرتے ہیں۔ زندگی بہت تیز ہو گئی ہے۔ گاؤں کا بنیا بھی ٹرک لئے سمگل کا مال ڈھوتا پھرتا ہے۔ ربڑ کے پہیے اور پیٹرول کی ٹنکی نے تمہیں طمانچہ مار کر پیچھے دھکیل دیا ہے۔ تم کسی زمانے میں اتنے ذہین تھے کہ نمک سے بھرے بورے کے ساتھ ندی میں بیٹھ گئے تھے اور اس وقت اٹھے تھے جب نمک گھل گھل کر ہلکا پھلکا بچوں کا کھلونا بن گیا تھا۔ گدھے کا بوجھ نہیں رہا تھا۔ لیکن آج کل تم گلی گلی صدائیں لگاتے پھرتے ہو ——

"ہے کوئی سخی داتا! جو مجھ پر کھاد کا بورا لادو ے۔ میری روٹی روزی کا سوال ہے!" ہاں، گدھا بھائی! میں جانتا ہوں تم پر اقتصادی کرائسس آیا ہوا ہے اور جس کے گھر میں دانے اور جیب میں پیسہ نہ ہو۔ اس سے سبھی رشتہ دار اور احباب منہ موڑ لیتے ہیں۔ کمہار، دھوبی، بنیا یہاں تک کہ

میلہ مویشیاں بھی جہاں کبھی دور دور سے مایہ ناز اور بلند پایہ گدھے تشریف لایا کرتے تھے تو اُن کی خرید و فروخت کو ایک اعجاز سمجھا جاتا تھا۔ اُن کے لیے الگ احاطہ مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب انھیں اس میلے میں ایک اچھی جگہ دینا بھی کنبہ پروری سمجھا جاتا ہے میاں گدھے! اسے کہتے ہیں کسی تہذیب کا سوال!

اسی طرح دنیا میں کئی تہذیبیں مٹ گئیں۔ سوچتا ہوں کیا تم بھی مٹ جاؤ گے اور تاریخ میں تمہارا ذکر صرف یوں آیا کرے گا کہ گدھے یہاں کے پرانے باشندے تھے۔ مشین نئے حملہ آور آئے اور انھیں مار مار کر جنگلوں کی طرف بھگا دیا گیا۔

لیکن گدھا جی! میں نہیں چاہتا کہ تم انسانوں سے الگ ہو جاؤ۔ کیونکہ انسان تمہارے بغیر مکمل نہیں ہے۔ اس لیے کرائسس کا مقابلہ ہندوستان کی طرح کرو اور اپنی پرانی پالیسی ترک کر کے اپنے لیے کوئی نیا پیشہ اختیار کرلو مثلاً انسانوں سے کہو، میں تمہارا بوجھ لادنے کے قابل نہیں رہا تو نہ سہی، لیکن تمہارے لیے دلپذیر لطیفے ایجاد کرنے کا موجب تو بن سکتا ہوں۔ تمہارے آباؤ اجداد میں سے چند ایک کا ذکر تو ادب عالیہ میں بھی آیا ہے۔ ایک بار مرزا غالب نے فرمایا تھا۔ دہلی میں تو انسان پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ گدھے صرف دوسرے شہروں سے یہاں آجاتے ہیں ــــ مرزا غالب کا مطلب شاید یہی تھا کہ انسان اور گدھے مل کر ہی دہلی شہر کو مکمل کرتے ہیں۔ اس لیے جی مت چھوڑو۔ اس شہر کی ادبی تاریخ میں تمہارے ذکر کا چانس اب بھی ہے۔

چڑیا کے نام ——— ۰

اے پیاری نازک اندام چڑیا جی!

میں یہ تو نہیں جانتا کہ تم کس گھر سے ہجرت کر کے غریب خانہ پر تشریف لائی ہو لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب ابھی یہاں میرا مکان نہیں بنا تھا تو اس جگہ ماضی کے کسی بادشاہ کے کھنڈر تھے۔ جن پر اُلوؤں کا بسیرا تھا۔ بادشاہوں اور اُلوؤں میں کوئی نہ کوئی چیز مشترک ہے۔ ورنہ وہ انھیں کھنڈروں پر تخت نشین نہ کر جاتے ——— لیکن نہیں چڑیا ڈارلنگ! تم دو چار گرام کی نازک بدن! تمہیں تخت و تاج کی یہ ثقیل فلاسفی ہضم نہ ہوگی۔ میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ جب شہنشاہ کے ان کھنڈروں پر انسان نے گھر بنا لیا تو اُلو بھاگ گئے اور تم آگئیں کیونکہ تم آبادی سے گھبراتے ہیں۔ لیکن تم انسانوں میں رہ کر چہچہاتی ہو۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گی تم نہ آتیں تو میں سمجھتا، تم اُلو ہو۔ یا میں ایک کھنڈر ہوں۔

جناب چڑیا! تم میرے کہنے کی ایک فرد بن کر رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن تمہیں دیکھ کر میرے دل میں برابر ایک خلش ہو رہی ہے کہ تم ہمیشہ کنفیوز کیوں رہتی ہو۔ جب تم پہلے دن آئی تھیں تو میرے ریڈیو سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھیں اور آنکھیں بند کر کے ایک ہجریہ گیت سننے میں مست ہو گئی تھیں۔ کیا کسی کمبخت چڑے نے تم سے بے وفائی تو نہیں کی؟ کبھی کبھی تم تین تین دن غائب رہتی ہو۔ آخر کہاں چلی جاتی ہو۔ منگل کے دن تم کچھ دانا دُنکا بھی نہیں کھاتیں؟ کیا کسی کی یاد میں ہجرت رکھتی ہو؟ ایک بار ہمارے گھر میں کوئی چڑا گھس آیا تھا تو تم اُس سے لڑ پڑی

تھیں۔ کیا وہ کوئی رقیب رو سیاہ تھا؟ اگر ایک چڑے نے تم سے بے وفائی کی ہے تو اُس پر تین حرف بھیجو۔ کسی اور سے لَو لگا لو۔ میرا مطلب ہے محبت کے فلسفے میں ماڈرن بن جاؤ۔ محبت کی پرانی قدروں سے مت چمٹی رہو۔ یوں مسلسل بیوگی کی زندگی گزارنی بھی تو دانشمندی نہیں۔ اس سے صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ تمہاری صحت کے آگے ہی ملاوٹی دانہ دنکا چگنے سے کافی مجنونانہ ہو چکی ہے۔ اِسے ملاوٹی عشق سے ڈاؤن نہ کرو۔

چند دن ہوئے تم نے دیوار پر لٹکے ایک فوٹو فریم کے پیچھے گھونسلا بنا لیا تھا۔ شاید نو مولود بچوں کے لیے۔ لیکن پھر خود ہی وہ گھونسلہ توڑ پھوڑ دیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ اولاد کے بغیر گھونسلے کے کیا معنی ۔۔۔؟ تم اپنے مستقبل کو چھوڑو۔ بچوں ہی کے مستقبل کا خیال کرو اور خوش رہا کرو۔

یقیناً تم کسی جذباتی پرابلم کا شکار ہو۔ جسے دیکھ دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوتا ہے۔ کسی دن مجھ سے کھل جاؤ کہ میرے دکھ سکھ سن کر شاید تمہارے دکھ بھی دور ہو جائیں اور تمہیں معلوم ہو جائے کہ بیوفائی میں انسان بھی اتنے دکھی ہیں، جتنی ایک چڑیا!!

اُس کی پوزیشن بہتر تھی۔ کیونکہ اسے دادی اماں کی حمایت حاصل تھی۔ آج کل کے زمانے میں اس حمایت کو خویش پروری کہا جاتا ہے۔ دادی کہتی تھیں کہ دھرم شاستروں میں بلّی کی بڑی مہما گائی گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے شاستر میں گائی گئی ہے۔ کیونکہ دادی کو ایک بھی شاستر کا نام نہیں آتا تھا۔

والد محترم بلّی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن جب ایک مرتبہ گھوڑے سے گر کر اُن کا گھٹنا اتر گیا تو بلّی کو بھی ایشور بھگت ماننے لگے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ میرے حصّہ کا دُودھ بلّی کو پلا رہے تھے اور گلو گیر لہجہ میں بلّی سے کہہ رہے تھے "اے مہان دیوی! اپنے بھگوان سے سفارش کر دے کہ میرا گھٹنا ٹھیک کر دے" اور کچھ ہفتوں بعد گھٹنا واقعی ٹھیک ہو گیا۔ قضا و قدر کی برکت سے کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد تو بلّی بالکل وی۔ آئی۔ پی بن گئی۔ گچھرے اڑانے لگی۔ لیکن گاؤں کے حکیم صاحب والد صاحب کے دشمن بن گئے کہ آپ نے میری دوائیوں کی پوری قیمت ادا نہیں کی۔

مگر میری بیوی کو یہ بلّی پسند نہیں تھی گھر والوں کی نظر بچا کر اس پر بیلنا رسید کر دیتی اُسے ایک شکایت یہ تھی کہ یہ کم بخت دُودھ ہمارا پی جاتی ہے۔ مگر فارہ پڑوسن کو پہنچا آتی ہے یعنی چوہے صرف اسی کے کھا آتی ہے ___ باقاعدگی سے چربی اور خوراک کھانے سے بیحد موٹی اور کاہل ہو گئی تھی ___ ڈٹ کر کھاتے ہی اُسے نیند آجاتی اور چوہوں کی آواز سننے کے باوجود آنکھ نہ کھولتی۔

یہ بلّی کبھی کبھی ایک بلّے کو بھی لے آتی تھی اور پھر دونوں چھت پر چڑھ کر سرگوشیاں کرتے رہتے۔ مجھے یہ بلّا کوئی لفنگا اور ہرجائی معلوم ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ

پیسے کی تہذیب

ہندوستان آنے سے پہلے میں کئی کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ کہ یہاں سونے کی چڑیا رہتی ہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ سونا تو موجود ہے۔ مگر چڑیا بھاگ کر ہندوستان سے باہر چلی گئی ہے۔

مجھے چڑیا کا یہ ردِ وطن پرستانہ نہیں لگا۔

مگر ایک بوڑھے بابا جی نے مجھے بتایا کہ چڑیا بھاگی نہیں، افلاس کا شکار ہو گئی۔ وہ تھوڑی سی مدت کے لیئے خلیجی ممالک کی طرف نکل گئی۔ جہاں کے کنوئیں تیل کی شکل میں سونا اگلتے ہیں۔ چڑیاں وہاں سے سونا اسمگل کر کے ہندوستان میں بھیجتی رہتی ہے۔

میں نے کہا۔ "بابا جی! مجھے تو بتایا گیا ہے۔ کہ چڑیا بھاگ گئی، مگر سونا یہاں چھوڑ گئی۔"

وہ بولا۔ " اجی چھوڑیئے! یہ خوش فہمی کا پروپیگنڈہ ہے، ورنہ جو سونا آج یہاں موجود ہے، وہ سمگل شدہ سونا ہے۔"

وہ باباجی ایک میڈیسن پارک کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اناج کی ایک ٹوکری اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اور فٹ پاتھ پر پچاس ساٹھ چڑیاں پھدک پھدک کر رہی تھیں۔ بابا ہر دو منٹ بعد اناج کی ایک مٹھی ان چڑیوں کی طرف پھینکتا۔ جس پر سبھی چڑیاں ٹوٹ پڑتیں اور اناج کا ایک دانہ منہ میں جاتے ہی رقص دلبری کرنے لگتیں۔

میں نے پوچھا۔ " یہ چڑیاں کون ہیں؟"

" یہ اُسی سونے کی چڑیا کی اولاد ہیں۔

بھوک انھیں دن بھر چگ چگ کر ادھ موا کر دیتی ہے۔ تو صبح یہاں آ جاتی ہیں۔ یوں جیسے زخم پر کوئی مرہم پٹی بندھوانے آ جائے۔"

" آپ ان چڑیوں کو کیا سمجھ کر اناج کے دانے کھلاتے ہیں۔ کیا سونے کی چڑیا کی اولاد سمجھ کر؟"

" نہیں، میں انھیں ہندوستان کے فاقہ مست عوام سمجھتا ہوں۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ سونے کی چڑیا اپنے پیچھے سونا نہیں چھوڑ گئی۔ فاقہ مست اولاد چھوڑ گئی۔ مگر خلیجی ممالک سے وہ جو سونا اسمگل کر کے بھیجتی ہے۔ وہ ان چڑیوں تک نہیں پہنچنے دیا جاتا۔ راستے میں کئی سرمایہ دار، کئی رئیس، کئی اسمگلر اور ان کے کئی دلال جو وزیروں کے زر خرید ایجنٹ ہوتے ہیں، سونے کی اینٹوں کو آپس میں بانٹ لیتے ہیں عوام

تک نہیں پہنچنے دیتے۔ کیونکہ ان کی تھیوری یہ ہے کہ عوام کے لیے بھوک ہی سب سے بہترین من بھاتا کھا جا ہے۔ عوام تک سونا پہنچ جائے۔ تو ان میں تکبر آجاتا ہے وہ روٹی دینے کی بجائے پتے اور بادام کھاتے رہتے ہیں۔

بعد میں مجھے ایک جلے بھنے دانشور نے بتایا۔ کہ یہ بوڑھا بابا مفلس چڑیوں کا ان داتا ویسے نہیں بن گیا۔ چند سال پہلے یہ خود ایک بہت بڑا اسمگلر تھا۔ کروڑوں کی جائیداد تھی۔ بڑے بڑے وزیر اور فلمی ہیروائن کے گلے میں پھول مالائیں ڈال کر اسے ہندوستان کا واحد نجات دہندہ ڈکلیئر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس کے نوجوان بیٹے کو کینسر ہوگیا۔ اور کینسر کا علاج نہ تو وزیر ہیں نہ فلمی ہیروائن نہ پھول مالائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کروڑوں روپے اور نوجوان بیٹا دونوں اس کی زندگی سے نکل گئے۔ اور یہ بالآخر خدا پرست اور عوام پرست ہوگیا۔

میں نے پوچھا "کیا خدا اور عوام کے تعلقات خوشگوار ہیں؟"

جلا بھنا دانشور بولا "میں تو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بوڑھا بابا مانتا ہے۔ اس لیے یہ جو کبھی خود سونے کی چڑیا تھا، ان مفلس چڑیوں کی بھوک مٹانے پر اتر آیا۔ اپنے خوفناک انجام سے ہراساں ہو کر یہ ان مفلس چڑیوں کو اناج کے دانے روزانہ کھلا دیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ خدا کے سامنے یہ اس کی معتبر گواہ ہوں گی۔ یہ جنھیں چڑیوں کے زخم لگتا ہے اس کے اپنے زخم ہیں۔ چند دانے کھلا کر یہ چوڑیوں کو مرہم نہیں لگاتا، اپنا مرہم پٹی کرتا رہتا ہے۔"

اسی چلے بھنڈ دانش ور کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں بے شمار دولت ہے۔ اگرچہ یہ برصغیر بیک وقت غریب بھی ہے اور دولت مند بھی۔ جن لوگوں کے پاس بے شمار دولت ہے وہ اُسے گنتے گنتے جب تھک جاتے ہیں تو گنتی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں، گنتی کا باقی کام آئندہ نسل کرے گی۔ جن کے پاس دولت نہیں ہے وہ بھی اپنے آپ کو غریب نہیں سمجھتے۔ بلکہ دولت مندوں کے یہاں ڈاکے ڈال لیتے ہیں، خوش پوش عورتوں کے طلائی ہار چھین کر بھاگ جاتے ہیں، اور پکڑے اس لئے نہیں جاتے۔ کیونکہ ہندوستان کا قانون بڑا لچکیلا ہے اور فراخ دلانہ ہے۔ بغیر ثبوت کے نہ کسی کو پکڑتا ہے نہ سزا دیتا ہے۔

مثلاً ہندوستان میں رشوت لینے کا رواج عام ہے۔ اور رشوت کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ چپڑاسی سے لے کر اسمبلی کے ممبر سے ہوتے ہوئے وزیر تک رشوت لیتے ہیں اور اُسے گناہ تصور نہیں کرتے بلکہ اسے پیسے کی تہذیب کہتے ہیں۔

پیسے تہذیب کا سب سے بڑا اسلح بلکہ غیر مسلح ہتھیار یہ ہے کہ لوگ نقلی چیز کو اصلی چیز کے بھاؤ پر بیچتے ہیں اور یوں دولت کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے ایک سوداگر خاندان کے بارے میں بتایا گیا کہ اس کی حویلی میں ایک دس فٹ چوڑا اور دس ہی فٹ لمبا چاندی کا صندوق ہے۔ جس پر گذشتہ چھ نسلوں سے سونے کا ایک

تالہ لگا ہوا ہے۔ صندوق کی چھت پر ایک سوراخ ہے۔ ہر نسل کے فرد پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر روز اپنی حسب استطاعت، روپے، چاندی، سونا، ہیرے، جواہرات، بیش قیمت موتی، ملکی اشیاء وغیرہ اس صندوق میں ڈالتا چلا جائے مگر کوئی بھی نسل کبھی بھی وہ تالا نہ کھولے۔

کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس صندوق میں اربوں کا مال پڑا ہے یا کھربوں کا۔ وہ خاندان اسے اپنی مقدس بچت اسکیم کہتا ہے۔ اس بچت اسکیم کی معلومات آخر کسی زمانے میں محکمہ آثار قدیمہ ہی کر سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے نوے فیصدی لوگ غریبی کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں۔ مگر وہ اس پر نہ برا مانتے ہیں نہ مچلاتے ہیں نہ حسد کرتے ہیں۔ روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ سنا ہے ان میں سے اکثر کو خدا کے درشن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے وہ پیار کے گیت گا کر اپنی روح کو پرچا لیتے ہیں — روح کے یوں پرچا رہنے کو وہ نصب العین کہتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ عام مشہور ہے۔ کہ دولت مندوں کو کبھی اطمینان قلب نہیں ملتا۔ کیونکہ اطمینانِ قلب ان کے نصیب میں نہیں ہے۔ یہاں جو لوگ نصیب سے محروم ہیں۔ وہ فقط دس فی صدی ہیں۔ بڑی لحیم و شحیم، رنگین و حسین کوٹھیوں میں رہ کر بھی انھیں نیند نہیں آتی۔ جب کہ ایک جیب کترا دن بھر میں چالیس پچاس روپے بھی جیب کاٹ کر حاصل کر لیتا ہے۔ تو پانچ روپے کے ٹھرے کا پوا پی کر بڑی گہری نیند سو جاتا ہے۔

ایک پچاس کروڑپتی نے مسلسل نیند نہ آنے سے تنگ آکر اپنی پانچ منزلہ

بلڈنگ سے چھلانگ مار کر خودکشی کرلی۔ اسے چندن کی سوا ندو کو نیٹس لکڑی سے جلا دیا گیا۔ کیونکہ اس نے وصیت میں یہی درج کرایا تھا۔ لیکن جب لاش کو آگ لگانے کا وقت آیا۔ تو اس کے بڑے بیٹے نے ایک تنازعہ کھڑا کر دیا۔ کہ وصیت نامہ جعلی ہے۔ اس لیئے میں ...... ؟ دھرم اور رواج کے مطابق صرف بڑے بیٹے کا حق ہوتا ہے۔ کہ باپ کی لاش کو آگ دکھائے۔ لیکن اس نے جعلی وصیت نامے کو آگ دکھانے سے انکار کر دیا۔

آخر شمشان گھاٹ کے پروہت نے ایک سوا ایک روپیہ دان لے کر لاش کو آگ دکھادی۔ کیونکہ وہ ایک مقدس گرنتھ سے ایک شلوک نکال کر لے آیا تھا۔ کہ تنازعہ کی صورت میں پروہت لاش کو آگ دکھانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

ہندوستان میں دولت کے جادو کو دھرم کا جادو توڑ سکتا ہے۔ معاملہ برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دھرم کے جادو کو دولت کا جادو بھی تار تار کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دولت اور دھرم دونوں کو گدی نشین مانا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ہندوستانی بڑے مرنجان مرنج لوگ مانے گئے ہیں۔ لڑتے ہیں مگر صلح کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی نہیں جانتے کہ ہم کس وقت اچانک صلح کریں گے۔ میں نے ایک بہت بڑے زمیندار کو دیکھا کہ اس نے ایک ہریجن دوشیزہ کی عصمت دری کی۔ جس پر ایک ہزار ہریجن مرد لاٹھیاں اور بیلچے لئے زمیندار کی حویلی پر حملہ آور ہوئے۔ زمیندار نے باہر آ کر اعلان کیا کہ ہر وہ ہریجن جو میری کھیتی باڑی پر مزارع کا کام کرتا ہے آج سے اس کی تنخواہ ڈیوڑھی کر دونگا۔

اس پر ایک ہزار ہریجنوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا اور صلح ہو گئی۔ شام کو زمیندار نے رام چندر یالسں کی کتھا رکھوادی۔ اور ایک ہزار ہریجن کے ساتھ بیٹھ کر پریتی بھوجن کیا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ باپ اور بیٹے کی یہ جنگ ہندوستان میں کبھی متنازعہ فیہ نہیں رہی۔ کہتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ ہریجن اگر کہیں سے گزر رہا ہوتا۔ تو وہ یہ آواز نکالتا ہوا گزرتا تھا۔ کہ ایک اچھوت گزر رہا ہے۔ لہٰذا سبھی مقدس لوگ راستے سے ہٹ کر اپنے اپنے گھروں میں گھس جائیں۔ ورنہ انہوں نے میری شکل دیکھ لی، تو اپنا قیمتی لباس اتار کر اسے جلانا پڑے گا۔ اور خود انھیں نئے سرے سے شفاف گنگا کے پانی سے غسل کرنا پڑے گا۔

گویا ہریجن کے آنے سے اس راستے پر کرفیو لگ جاتا تھا۔

اب ہندوستان میں صنعتی عہد آچکا ہے۔ اس لیے بڑے بڑے امرا اور وزرا ہریجنوں کے ساتھ ایک ڈرائنگ ٹیبل پر پریتی بھوجن کرتے ہیں۔ کئی صنعتی دور کے امیر زادے اور زادیاں تو ڈرائنگ ٹیبل پر اپنے پالتو کتوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی پریتی بھوجن کرتے ہیں۔ نئے ہندوستانی زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی خاطر زیادہ سے زیادہ مضحکہ خیز حرکت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ وہ پالتو کتوں کے ڈاگ شو کرتے ہیں اور سوسائٹی میں عزت پاتے ہیں۔ وہ ہریجنوں کی غلیظ بستیوں میں جا کر ہریجنوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اور ان کے ووٹوں سے جیت کر وزیر بن جاتے ہیں اور سوسائٹی میں عزت پاتے ہیں۔

عالم و فاضل لوگ

ہندوستان میں کل ملا کر ستر (۷۰) عالم و فاضل رہتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک عالم سے بے ہودہ سا سوال کیا۔

"جناب! فقط ستر کیوں؟ اکہتر کیوں نہیں۔"

اُس نے جواب دیا "کیونکہ ہندوستان کی آبادی ستر کروڑ ہے۔ اگر اکہتر واں عالم ہوتا۔ تو وہ کسی کام نہ آتا۔"

میں نے کہا۔ "ستر عالم اور ستر کروڑ باشندے؟ یعنی چہ چیز؟"

"یعنی یہ کہ ایک کروڑ باشندوں کے لیے ایک عالم کافی ہے جو انھیں علم پڑھاتا ہے۔"

"وہ انھیں کونسا علم پڑھاتا ہے۔"

"وہ انھیں یہ علم دیتا ہے۔ کہ بے وقوف رہنے میں کتنی بڑی برکت ہے۔"

میرا سوال بے ہودہ تھا۔ لیکن جواب "ہودہ" نکلا۔

اگرچہ ہندوستان میں صرف ستر عالم وفاضل ہیں۔ لیکن عام باشندوں میں بھی علم کی کوئی کمی نہیں۔ آپ کسی بس ڈرائیور سے بات کریں یا یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے۔ وہ بھی آپ کو رامائن کی چوپائیاں اور گیتا کے دوہے اسی اعتماد سے سنا دیں گے جیسے یہ خود انھوں نے ہی تخلیق کیے ہوں۔ میرا مطلب ہے۔ وہ انھیں پڑھتے نہیں مگر زبانی ضرور سنا دیتے ہیں۔ میں نے ایک سابق چانسلر سے ملاقات کی جو آنکھ سے بہت کم دیکھ سکتا تھا۔

اور کان سے اس سے بھی کم سن سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجھے چاروں وید زبانی حفظ ہیں۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے انھیں تحریری بھی پڑھا ہے؟

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میرا حافظہ بہت زبردست ہے۔ مثلاً مجھے اعداد کے ایک لاکھ شعر یاد ہیں"

وہ وائس چانسلر خود بھی شاعر تھا۔ جب وہ خود شعر تخلیق کرتا تو اسے یاد نہیں رہتا کہ یہ کسی دوسرے شاعر نے تخلیق کیا تھا۔ حافظہ مناسب حد سے کچھ زیادہ بڑھ جائے تو آدمی اپنے اور پرائے شعر میں تمیز کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔

میں نے عام ہندوستانیوں کے منہ سے یہ شکایت سنی۔ کہ ہمارے پاس علم وفضل کے جتنے بیش قیمت خزینے تھے۔ ان کی سبھی کتابیں سالے فرنگی سامراجی حاکم چرا کر لے گئے۔ ایک برہمن نے تو مجھے دو تین اشلوک تک سنا دیئے اور کہا۔ دیکھئے ان اشلوکوں میں صاف لکھا ہے کہ ہم ہوائی جہاز بنانے کا علم جانتے تھے۔

میں نے کہا۔ مگر رامائن میں تو کہیں بائیسکل تک کا ذکر نہیں آتا۔ اس کا مطلب ہے آپ کے رامائن کے زمانے میں کوئی بائیسکل فیکٹری نہیں تھی۔

وہ بولا۔ "رامائن کا اصلی نسخہ سالے فرنگی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ورنہ اس میں بائیسکل، موٹر کار، ریل گاڑی ہر شے کا علم موجود تھا۔"

"کیا ایٹم بم بھی آپ کے ماضی میں بنائے جاتے تھے۔"

"ہاں، بنائے جاتے تھے۔"

"اُن کا استعمال بھی کبھی کیا تھا؟"

"مہابھارت کی جنگ میں کیا تھا۔ تو لاکھوں کروڑوں انسان بھگتا دیئے گئے تھے۔ صرف پانچ پانڈو اور ایک کتا بچ گیا تھا۔"

"وہ کتا کس کا تھا۔"

"اجی، وہ تو فرشتہ اجل تھا۔ جو کتے کا روپ دھار کر فنا کرنے آیا تھا۔"

"اب سمجھا وہ کتا نہیں تھا، دراصل ایٹم بم تھا۔"

"ہاں، خدا تمہارا بھلا کرے، ممکن ہے وہ ایٹم بم ہی ہو۔"

بہرکیف، چونکہ آزادی کے بعد ہر ہندوستانی پر انکشاف ہوا، کہ ہمارے علم و فضل کی سبھی لافانی کتابیں یورپ کی لائبریریوں میں چلی گئی ہیں۔ اسی لیئے کئی نوجوان ہندوستانی اب دھڑا دھڑ یورپ جاتے ہیں۔ اور علم و فضل کی کوئی نہ کوئی ہندوستانی کتاب ڈھونڈ کر وہاں سے لے آتے ہیں۔ ڈاکٹری، فزکس، کیمسٹری، آرکیالوجی، فلسفۂ یوگ، حتیٰ کہ ایک بڑھئی تو پیرس سے ایک ایسی کتاب لے آیا جس میں پلنگ بنانے کا کماحقہ علم درج تھا۔

گویا علم و فضل کی کیفیت، ہندوستان میں یوں ہے۔ کہ علم پہلے یہاں پیدا ہوا، پھر یورپ کے لوگ تیغ و تبر کے زور پر وہ علم و فضل یورپ لے گئے۔ اور اب یورپ سے پھر ہندوستان میں واپس آ رہا ہے۔ ایک کیمسٹ نے مجھے بتایا کہ میں یہ جو آپ کو ایلوپیتھی کی تین گولیاں پیچش دور کرنے کے لیئے دے رہا ہوں۔ دراصل یہ ہندوستانی فن طب کا ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ لونگ کے دو ٹکڑے لیجئے اسے اُبال کر سکھا لیجیے اور ایسی گولیاں بنا لیجیے۔ دو لونگ قیمت پندرہ روپے، اور میں ان دو کیپسولوں کے آپ سے پندرہ روپے چارج کر رہا ہوں۔

وہ بلّی کو اپنے ہمراہ کہیں بھگا لے گیا۔ میری بیوی نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن منحوس چار دن بعد پھر لوٹ آئی تو اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب ندامت اور یاسیت سی جھلک رہی تھی۔ شاید اُسے بلّے کی بے رخی اور ہرجائیت کا غم تھا۔ لیکن ہفتہ بھر بعد وہ بلّا کم بخت پھر آگیا اور یہ محترمہ اس کے ساتھ پھر چھت پر چڑھ گئیں۔ اُن کے رویّے پر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بلّی ضرور پچھلے جنم میں انسان رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میری نانی ہوگی۔ کیونکہ سُنا ہے وہ بھی شادی سے پہلے نانا مرحوم کو چھت پر جا کر اشارے کیا کرتی تھی۔ بلّی گھر میں موجود تھی مگر اس کے باوجود چوہے ہمارے گھر کے مستقل باشندے تھے۔ کبھی کبھی تفریح طبع کے لیے پڑوسیوں کے گھر کا چکّر لگا آتے اور پھر لوٹ آتے پڑوسیوں کو شکایت تھی کہ آپ کے چوہے ہمارے گھر میں گھس آتے ہیں۔ انھیں اپنے ہی گھر میں سنبھال کر رکھیے۔ اگرچہ تاریخی طور پر یہ کبھی طے نہیں ہو سکا کہ یہ چوہے سب سے پہلے کس گھر میں داخل ہوئے تھے ہمارے یا پڑوسیوں کے۔ مگر ہمارے گھر والے شرافتِ نفس کے مارے یہ تسلیم کر لیتے تھے کہ یہ ہمارے ہی چوہے ہیں۔ کیونکہ ہمارا ہی نقصان زیادہ کرتے ہیں۔

ان چوہوں سے ہمارے تعلقات اکثر ناخوشگوار ہی رہتے۔ اگرچہ ہم نے انھیں گھر کے افراد کبھی تسلیم نہیں کیا مگر یہ ہمارے ہی بچوں کی طرح گھر میں دندناتے پھرتے رہتے۔ ہمارے گھر کی جو چیز بھی گم ہو جاتے وہ یا تو پڑوسن کے یہاں سے نکلتی یا چوہوں کے ٹھکانے سے صرف ایک بار یہ شک ہوا تھا جب ہمارے صابن کی ایک ٹکیہ پڑوسن کے غسل خانے سے برآمد ہوئی تھی۔ پڑوسن نے الزام لگایا کہ آپ ہی کے چوہے یہاں چھوڑ گئے ہیں مگر میری بیوی کا اصرار تھا کہ ہمارے چوہے

میں نے کہا۔ "تم یہ بے ایمانی کیوں کرتے ہو۔"

وہ بولا۔ "کیونکہ ہم ہندوستانی لوگوں کی روح ابھی اپنے شاندار ماضی کی کھوج میں گمراہی کا شکار ہے۔ وہ امپورٹڈ چیزوں پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ دیسی چیزوں پر نہیں۔"

بہر کیف ہندوستان کے علم و فضل کا آج کل یہ عالم ہے کہ وہ دیش بھگتی کا علم بھی ان مغربی ممالک سے حاصل کر کے لاتے اور خوش ہوتے ہیں جو ان کی عالمانہ کتابیں چرا کر یہاں سے لے گئے تھے۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ اتنا علم بھی نہیں جانتے کہ جو علم وہ یورپ سے حاصل کر رہے ہیں، دراصل ان کا اپنا ہی چوری شدہ علم ہے۔ شاعری کا علم ہو یا مصوری کا، پینٹنگ کا علم ہو یا سنگ تراشی کا۔ حتیٰ کہ کوئی انڈین آرکیٹیکٹ جب ہندوستان میں کسی بلڈنگ کا نقشہ بناتا ہے تو وہ یورپ کے کسی انگریز، فرانسیسی یا پرتگالی آرکیٹیکٹ کی لکھی ہوئی کتاب کا حوالہ بڑے تکبر سے دیتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ اس کتاب کا مال خالص ہندوستانی ہے۔ صرف اس پر یہاں اور وہاں رنگ اور لکیریں، یورپ کی لگادی گئی ہیں۔

حتیٰ کہ ایک ماڈرن لیڈی (یہاں ماڈرن لیڈی صرف اسے سمجھا جاتا ہے، جو انگلش میڈیم سکول اور کالج میں تعلیم پاتی رہی ہو) اپنی کار میں ایک سرمئی رنگ کی پالتو کتیا کو بغل میں بٹھلائے اس کے ساتھ بوسہ بازی میں مصروف تھی۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کتیا سے بوسہ بازی کیوں کر رہی ہیں۔ کیا آپ کا کوئی شوہر یا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "ہیں تو سہی مگر یہ کتیا امپورٹڈ ہے۔ ہاؤ سویٹ ہاؤ لولی!"

ہندوستان میں آزادی کے بعد علم و فضل تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ ہندوستانیوں

تک یہ غلط افواہیں پہنچ گئی ہیں کہ دنیا کے دوسرے ملک علم و فضل میں آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس لئے ہر ہندوستانی کو طیش آگیا ہے کہ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہیگا۔ چنانچہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اگر ہر تیسری دکان پان سگریٹ کی ہے تو ہر چوتھی دکان میں پرائمری اسکول کھل گیا ہے۔ پان ہندوستان کا کلچر ہے اور کلچر جبھی پروان چڑھ سکتا ہے، جب علم و فضل حاصل کیا جائے۔ چنانچہ پان اور علم دونوں برابر بڑھ رہے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ پرائمری سکول میں پاس یا فیل ہونے کے بعد طالب علم پان کی دکان کھول لیتا ہے۔ کیونکہ پان فروشی سے اُسے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے، جتنی ایم اے کو علم سکھانے والے پروفیسر کو بھی تنخواہ نہیں ملتی۔ پرائمری سکولوں میں یہ علم دیا جاتا ہے "بچو! ہمیشہ سچ بولا کرو۔ ایمان کی کمائی کیا کرو" لیکن یہ علم حاصل کرنے کے بعد جب وہ بڑے ہو کر عملی زندگی کے دائرے میں گھومتا بلکہ گھمایا جاتا ہے۔ تو یہ دیکھ کر دستِ تاسف ملتا ہے۔ کہ سکول میں اُسے جو علم دیا گیا تھا وہ انتہائی گمراہ کن تھا۔ ورنہ عملی زندگی کے میدان میں اگر جھوٹ نہ بولا جائے۔ اور ایمان کو سینے کی روشنی بنا کر رکھا جائے تو یہ روشنی زندگی میں اندھیرا پھیلا دیتی ہے۔ اور اندھیرے اور اندھیرے کوئی دو لقمے کھلانا بھی پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ ہندوستان میں علم و فضل کے بعد جھوٹ بولا جاتا ہے، ایمان بیچا جاتا ہے۔ جبھی جا کر پھل اور میوے اور شیرینیاں ملتی ہیں ورنہ سوکھی روٹی اور کڑوی چائے کا کپ ہی پلے پڑتا ہے۔

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے میری ملاقات ہوئی۔ اُس نے پورا ہندوستانی علم و فضل لندن کی ایک لائبریری میں بیٹھ کر انگریزی زبان میں پڑھا۔ اُس کا بیان تھا کہ پہلے وہ علم و فضل ہندوستانی زبان سے انگریزی میں منتقل ہوا۔ اور میں اُس انگریزی ترجمہ کو اب ہندوستانی زبان میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ میں نے پوچھا، "گویا موریلیے کو اپنا۔ اور اب آپ کو پرے کو مور بنا رہے ہیں۔ اس میں تک کیا ہے، اور تخلیق کہاں ہے؟"

وہ بولا "تک بڑا سیدھا ہے۔ کہ اگر میں ایسا نہ کروں۔ تو ہندوستانی مجھے عالم و فاضل نہیں مانیں گے" اور پھر اس نے مجھے وضاحتاً بتایا کہ پہلے ہماری ہندوستانی تہذیب صرف اس شخص کو عالم و فاضل مانتی تھی جو برہمن خاندان میں پیدا ہوا ہو پھر علم و فضل کی کھالتی میں ایک تبدیلی آئی۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر اقبال ؎

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ڈاکٹر اقبال کے سبھی شعر بھی دوسرے غیر ملکی عالموں کے ترجمے تھے۔

اور تبدیلی یہ آئی۔ کہ جو شخص برہمن خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ چاہے وہ الف کے نام سے بھی نہ جانتا ہو۔ اُسے عالم و فاضل سمجھ کر اس کی تعظیم کی جاتی تھی۔ نہ صرف تعظیم بلکہ سماج اُسے بھوجن کھلانے کی ذمہ داری بھی لے لیتا تھا۔ چنانچہ جسے صبح شام مفت کا بھوجن مل جائے اور مفت کا پہناوا بھی میسر آجائے اسے پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے پوچھا "کیا ایسے برہمن آج بھی موجود ہیں۔ جو پڑھتے نہیں صرف تعظیم کرواتے ہیں"؟

وہ بولا "ہاں اِکا دُکا مل ہی جاتے ہیں۔ مثلاً میرے محلے میں ایک بوڑھا برہمن ہے۔ ساٹھ برس کی عمر تک اس کا ذخیرہ تین اشلوکوں سے آگے نہیں بڑھا۔ ایک اشلوک جنم کے لیے دوسرا شادی کے لیے اور تیسرا موت کے وقت پڑھ دیتا ہے۔ ایک خوبی اس میں اور بھی ہے کہ وہ اشلوک تب پڑھ دیتا ہے مگر ان

کے معنی نہیں جانتا۔ اگرچہ جن گھروں میں جا کر وہ یہ اشلوک پڑھتا ہے، نہ خود بھی اس کے معنی نہیں جانتے۔ اور اسی میں ہی برہمن کی عزت اور حشمت کا راز پوشیدہ ہے۔

"لیکن" پروفیسر نے اپنی بات کو ایک موڑ دیا "جیسا کہ میں نے کہا تغیر میں ہی ثبات کا راز پوشیدہ ہے۔ سماج میں ایک اور تبدیلی آئی - کہ ہندوستان آزاد ہو گیا تو علم برہمنوں کی میراث نہیں رہا۔ بلکہ میراث کسی بھی چیز کی نہیں رہی۔ کھشتری کے لیے لڑنا، ویش کے لئے تجارت کرنا، اور شودر کے لیے کوڑا کرکٹ اٹھانا لازمی نہیں رہا۔ سارا علم و فضل اقتصادیات کی غلامی کرنے لگا۔ اب برہمن، بائیسکل پر گھوم کر لاٹریوں کے ٹکٹ بیچتا ہے، کھشتری ٹائپ رائٹنگ کا کورس کرتا ہے۔ ویش نے بڑے بڑے پبلک اسکول کھول رکھے ہیں۔ اور شودر کو گورنری کا عہدہ مل جاتا ہے۔

میں نے پوچھا "شودر کو گورنری؟"

"جی ہاں! آزاد سرکار نے شودروں کے لیے مخصوص کوٹہ مقرر کر رکھا ہے۔ انھیں کالج اور ملازمت میں داخلے کے لیے ترجیح دی جاتی ہے۔ بلکہ ایک برہمن زادے کو میں جانتا ہوں میڈیکل کالج میں اُسے داخلہ ملنا مشکل ہو رہا تھا تو اُسے ایک ممبر اسمبلی نے یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ دے دیا کہ اس کی ماں برہمن تھی مگر اس کا باپ ہریجن تھا۔ لہٰذا اسے داخلہ دے دیا گیا۔" میں نے اس پروفیسر سے پوچھا "آپ اتنے عالم و فاضل ہیں۔ اس علم و فضل سے تو آپ کی اچھی خاصی گزر بسر ہو جاتی ہوگی؟"

تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا "وہ اچھی کہاں ہوتی ہے۔ میں نے کہا نا؟ ہندوستان میں کل ستر عالم و فاضل ہیں۔ اس کے علاوہ ہم ایسے لاکھوں عالم و فاضل ہیں جن کی ماہانہ آمدنی سے گزر نہیں ہوتی۔ تو وہ وقت نکال کر معمے حل کرتے رہتے ہیں۔ جن میں لاکھوں روپے ملنے کے چانس ہوتے ہیں۔"

اوٹ پٹانگ

اگر ایک طوطے کی پیٹھ پر کوا بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگے۔ تو ہم دانشمند لوگ کہیں گے یہ اوٹ پٹانگ بات ہے۔ مگر دانشمند لوگوں کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ کوے کے متعلق ان کا نقطہ نگاہ حاسدانہ ہے حالانکہ کئی کوے جن کے پاس ساتواں بکری پڑھ ہو ان کی کائیں کائیں کو سپیریارٹی کامپلیکس (SUPERIORITY COMPLEX) ہو جاتا ہے اور وہ طوطے کو بھی (اپنا میاں مٹھو سمجھنے) لگتا ہے اور طوطے میں تو پاتو بننے کی خصلت ہوتی ہی ہے۔ اس لیے وہ مالک کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو الہام سمجھ کر رٹتے ہیں یعنی بس سو بس سر کرتا رہتا ہے یہ اور بات ہے کہ تواریخ اس قسم کے الہام کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ ہم نے بڑی تہذیبوں کو اسی کائیں کائیں کے الہام پر شہید ہوتے دیکھا ہے لیکن جب خدا کی طرف سے پوزیشن واضح کی گئی کہ یہ الہام عرش بریں سے جاری نہیں کیا گیا۔ بلکہ ساری شرارت کوے کی ہے۔ جو لا اللہ پڑھ کر بندوں کو گمراہ کرتا تھا۔ تو طوطے ٹھنڈی آہ بھر کر ریڈیو پر اعلان کرنے لگے۔ کہ حضرات! اگرچہ ع

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

لیکن امن عالم کی خاطر ہم "سیز فائر" کرتے ہیں۔ اگرچہ کوے کے احسانات کو ہم فراموش کر سکتے جس نے آڑے وقت میں ہماری پیٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کی اور ہماری ٹیں ٹیں کو پاک پروردگار کی وحی کہا اور اس طرح ممتاز مقام عطا کیا۔

لیکن سب سے ناگفتہ بہ حالت پاک پروردگار کی ہے جسے ہر آدمی اپنے ہی سانچے میں فٹ کر لیتا ہے۔ چاہے اس میں اللہ کا دم گھٹ جائے۔ سفید ہاتھی پر سنہری جھول رکھ کر ایک

گل بچھڑ مہاراجہ جب ڈھائی انچ لمبا تلک لگائے مندر کی طرف بڑھتا ہے۔ تو پریوی پرس کے پستول سے لیس ہو کر پاک پروردگار کی مورتی کو جیسے حکم دیتا ہے "ما میں تیری گردن کے لیے ایک لاکھ روپے کا طلائی ہار لایا ہوں۔ اسے قبول کر لو"

اور پاک پروردگار کی مورتی جو شاید پستول سے خوف کھاتی ہے، مالا پہن کر ڈپلومیٹک لہجے میں کہتی ہے۔ "تھینک یو!"

اور مہاراجہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا پارلیمنٹ کی طرف بڑھتا ہے اور گرجتا ہے۔ "میرے مقدس پریوی پرس کو ہاتھ مت لگاؤ کیونکہ اسے پاک پروردگار کی آشیرواد حاصل ہے۔ اعتبار نہیں آتا تو ایک لاکھ روپے کے طلائی ہار سے پوچھ لو۔"

مگر پارلیمنٹ طلائی ہاروں کی پروردہ تو ہوتی نہیں۔ لاکھوں جھونپڑیوں کی گری پڑی تیلیاں چن چن کر یہ آشیانہ بنتا ہے۔ لہٰذا طلائی ہاروں اور اس آشیانے میں مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ہر تصادم پر فضاؤں میں آوازیں گونج اٹھتی ہیں۔ "جنگ کڑی ہے، خون بہے گا۔" یہ آوازیں سپریم کورٹ کی سنگین دیواروں سے بھی جا ٹکراتی ہیں۔ جھگیاں اور سپریم کورٹ؟ ہا ہا۔ قہقہے اٹھتے ہیں کہ کیا یہ بھی کوئی مقابلہ ہے کہ مٹی میں ملے ہوئے آنسو اٹھ کر روٹی کھانے کے دعوے دار بنتے ہیں۔

لیکن اس ڈیموکریسی کا برا ہو جس نے حق کے احساس کو عام کر دیا۔ ہاتھی کی سنہری جھول بائیسکل رکشا کی تھرڈ ریٹ چمڑے کی گدی کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن تاریخ جب بھی کوئی موڑ کاٹتی ہے۔ تو بائیسکل رکشا بھی لاکھ روپے کے ہاتھی کو چیلنج کرتی ہے۔ "خبردار! ذرا سنبھل کر اپنے احمقانہ پاؤں آگے بڑھانا۔ راستے میں تیلیوں کی ایک جھگی کھڑی ہے جس کی پیشانی پر اگرچہ رائل فیملی کے تاج کی کلغی نہیں ہے لیکن ووٹ کی پرچی تو ہے۔"

بس ساری خرابی کی جڑ یہی ووٹ کی پرچی ہے جس نے بڑوں بڑوں کو بوکھلا دیا ہے۔ حتیٰ کہ ان

رئیس زادوں اور تاجروں کو بھی جو سوشلزم کے نام پر جب جمہوریت سے کھیل رہے ہیں اور چرس اور شراب کی سمگلنگ سے ان کی جو ڈیڑھ ہزار گز کے گھیرے میں عظیم الشان کوٹھی تیار ہوتی ہے دو پٹو سے کہہ کر اس کا نام " بار گیٹیا " رکھ لیتے ہیں - تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے - جیسی یہ کسی کرشن بھگوان کے اندر بڑا سا ڈسٹمبر (Disturbance) بن گورہتی ہے - اور دوسرے اس کوٹھی کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر سوشلزم پر ریزولیشن ڈرافٹ کرتے رہیں - مگر ہائے رے سوشلزم کی تقدیر! اس غریب پینٹر کے بل کی رقم بھی نہیں چکائی جاتی جو " بار گیٹیا " کے آہنی دروازے پر کھڑا سردی میں ٹھٹھر رہا ہوتا ہے اور کوٹھی کے بُل ڈاگ پر سجدہ ریز ہو کر کہہ رہا ہوتا ہے " ذرا اندر دیکھ کر آؤ - کہ صاحب باہر آ گئے ہیں یا بارہ ستو رکل شام سے باتھ روم میں ہی ہیں "

اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ پینٹر اپنی فریاد سپریم کورٹ تک نہیں پہنچا سکتا کیونکہ انصاف کا ترازو طلائی پلڑوں سے بنا ہوا ہے - اس ترازو میں ایک طرف بھولا ناتھ پینٹر کو رکھ دو - اور دوسرے میں غیر مار کیٹ کے خداوند بھولا ناتھ سیٹھ کو تو ڈنڈی بنانے کے لیے ڈنڈی ضرور ماری جائے گی - بھولا ناتھ دونوں ہیں - لیکن نقطہ نام کا یکساں آہنگ انصاف کا ضامن نہیں بنا کرتا - اگرچہ صرف نام پر ہی عدل جہانگیری کی بنیاد رکھی جاتی تو کئی چھوٹے اور صوتی اعتبار سے نہایت ناقص نام کبھی مل ملیں فیکٹریوں کی دیواروں پر کندہ نہ ہوتے - آپ آج ایک سوشل ویلفیئر سوسائٹی بنا لیجئے جس کے مقاصد ظاہر ہے اعلیٰ ہوں گے سے پینٹر اور سیٹھ دونوں متفق ہوں گے - سیٹھ بھولا ناتھ اس سوسائٹی کی میٹنگ اپنی ہی کوٹھی پر بلائے گا - کیونکہ پینٹر کے پاس ڈنلپ پلو والا فرنیچر نہیں ہے بلکہ صرف ننگے پیں اور ننگے پلوں سے سوسائٹی کی ویلفیئر کبھی نہیں ہو سکتی - اور پھر وہ طلائی پلڑے اکیلوں کا عادی بھی تو نہیں ہوتا - اعلیٰ مقاصد کو اعلیٰ فرنیچر سے الگ کرنا سوشل ویلفیئر کرنے والے ڈینگ بازوں کے بس کا روگ نہیں - اس لیے کسی بہت

جھٹکے کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کو ایک شاک ٹریٹمنٹ SHOCK TREATMENT دے سکے۔

جب تک ذہن کے چالو ڈھانچے کو موت نہیں پہنچے گا۔ مینر اپٹ لیلیٹی ویژن کا سارا خواب تو دیکھ سکے گا کیونکہ جمہوریت میں خواب دیکھنے کی کھلی آزادی ہے۔ لیکن اس خواب کی تعبیر مینر کے گھر کے دروازے میں داخل نہیں ہو سکتی کیونکہ ٹیلی ویژن کی کیبنٹ بہت چوڑا ہوتی ہے اور اس کے دروازے کا طول و عرض تنگئ داماں کا شاکی ہوتا ہے۔

البتہ اس تنگئ داماں کا ایک علاج ان ڈنڈی مارنے والوں نے تلاش کر لیا ہے کہ اگر زر و سیم کو ہی سماجی مرتبہ اور احترام کا مرکزی نقطہ بنانا ہے۔ تو پھر شرفا کو علاج یہ ہے بے حس کر دو۔ تاکہ وہ بولنے کے اہل ہی نہ رہیں۔ اور تم خود اسے بھولا ناتھ شنکر داس ٹیڑھی انگلی سے زر و سیم کا گھی نکالو۔ سمگلنگ، رشوت، غبن، بلیک مارکیٹنگ، سیکڑوں راستے کھلے ہیں۔ جن پر (ذرا حیا کی آنکھیں بند کرنا ہوں گی) چل کر سماجی احترام کو اپنی منا پلی بنا سکتے ہو۔ شرفا بے حس ہیں اور اخلاقی اقدار گونگی ہیں۔ اور مذہبی و اخلاقی کتابوں کو اندھوں کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ان کا مطالعہ جاری رکھو، عاقبت سنوارنے کے لئے بیحد مفید مطلب ثابت ہوگا۔ چنانچہ دیدۂ بینا لاکھ چلائے۔ مگر اندھوں کے سامنے اس کی پیش نہیں چلتی۔ تھیلیوں کے منہ کھل جاتے ہیں اور ہر بہبسا کے، جادوگر یا تھ یں ہوں کنڈیلیے پارلیمنٹ پر چڑھ دوڑتے ہیں اور جمہوریت کے نام پر جارحیت کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ مقدس منتروں کی گونج جب سیکولرازم کے نام پر پتھروں اور چاقوؤں کے اندر گھس جاتی ہے۔ تو سرکاری ریکارڈ میں چند ایک ٹھنڈی آہوں کے ساتھ یہ انکشاف تحریر کیا جاتا ہے کہ نجانے مندر کا ناقوس تھا یا مسجد کی اذان؟ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور ہزاروں اشخاص کھیت رہے۔ وہ ہزاروں اشخاص جو پاپی پیٹ کے لئے دو نوالے حاصل کرنے کے لئے نکلے تھے۔

اور پھر ان بے گناہ مقتولوں کے لئے دعائے خیر مانگی جاتی ہے۔ نمازیں ادا کی جاتی ہیں،

بھگوتی جاگرن کے ڈھول بج اٹھتے ہیں۔ عود و صندل کی خوشبو میں رقص کرتی ہیں۔ اور رقص و خوشبو پر چونکہ خرچہ اٹھتا ہے، اس لیئے بے گناہوں کی گناہگار روحوں کی تسکین کے لیئے یہ خرچہ بھی لوگ برداشت کرتے ہیں جو چاقو اور چھریوں کے سپلائر تھے۔ کفر کو وحدت کا سبق پڑھانے والے کفر ہی کے مسلمہ نمائندے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ یہ حسین جرم کرتے ہیں اس لیئے آزاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں زر و سیم کی تھیلی ہوتی ہے اور یہی تھیلی اس طاقت کا سرچشمہ ہے، جو سوسائٹی کو سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح چابک کے اشاروں پر چلاتی ہے۔

لیکن کیا یہ اندھیرا یونہی پروان چڑھتا چلا جائے گا؟ سوچنے والے اس سوال کا جواب سوچ رہے ہیں۔ ابھی ابھی بارہویں تیرھویں صدی کا وحشی اور پسماندہ ذہن بڑی بڑی بڑیں ہانک کر میدان میں ٹینک اور ہوائی جہاز لے آیا تھا۔ تاکہ اس بنیاد کو پختہ کرے۔ جو ۱۹۴۷ء میں رکھی گئی تھی۔ لیکن وقت میں ارتقاء کا نامحسوس عمل جاری ہو چکا تھا۔ جس سے یہ وحشی ذہن آنکھیں بند کیئے ہوئے تھا۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان کئی طوفانی دریا ابھرے اور بہہ کر آگے نکل گئے تھے فرقہ پرستی کے جوش میں ہوش کی آمیزش ان وحشیوں کے لیئے خطرناک ثابت ہوئی۔ تاریخ نے ایک اور ورق الٹا۔ جوتشیوں کو حیرت میں ڈبو گیا کیونکہ انھوں نے دیکھا ۱۹۴۷ء کی فرقہ پرستی کی ۱۹۷۱ء کے سیکولرازم سے شدید ٹکر ہوئی۔ اور نتیجے میں طوطے کی پیٹھ پر کوا بیٹھا کائیں کائیں کرتا دیکھا گیا۔ اور دیدۂ بینا اس صورت حالات پر اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکی۔

ختم شد

"Forwarded with compliments of the
Ministry of Education, Govt. of India"

اپنی مطبوعات

انور	منشی فیاض علی ایڈووکیٹ	۵۰/-	
شمیم	" " "	۳۵/-	
غزل	شریف پروین	۱۴/-	
پیاس کا صحرا	"	۲۰/-	
بات میں گھات	فکر تونسوی	۲۰/-	
فکریات	"	۱۷/-	
آدھا آدمی	"	۱۷/-	
پیاز کے چھلکے	"	۱۵/-	
نیکی کر تھانے جا	ابراہیم جلیس	۱۱/-	
اوپر شیروانی اندر پریشانی	"	۱۱/-	
اے دلربا تیرے لئے	شوکت تھانوی	۱۲/-	
مرزا غالب پارک میں	اے حمید	۱۲/-	
اُجالے	مسرور جہاں	۲۵/-	
شام و سحر	"	۱۶/-	
اچانک	"	۱۵/-	
رنگ ہزار	"	۱۲/-	
رشتہ پیار کا	"	۱۳/-	
اندھی راہیں	تنویر زہرہ بخاری	۲۵/-	
ضمیر	عظمت رضا	۲۶/-	
چشم نم	"	۱۲/-	
دامن	"	۲۴/-	
توہین	"	۱۷/-	
تسکین	"	۱۶/-	
کرشمہ	"	۱۵/-	
راکی	"	۱۰/-	
ایک خواب ایک حقیقت	زلیخا حسین	۱۸/-	
عنبرینہ	مس رافیہ	۱۶/-	
اشک گاں	بیگم رقیہ سلیم	۱۶/-	
زخمی کلیاں	ریحانہ رضوی تبسم	۲۸/-	
سوکھے پیڑ سبز پتے	گلشن نندہ	۱۴/-	
گھاٹ کا پتھر (پاکٹ)	"	۸/-	
راکھ اور انگارے (پاکٹ)	"	۶/-	
سب اس پر ایک نظر	سہیل بخاری	۱۰/-	
ایک کیسہ اور سہی	یاسمین صوفی	۲۵/-	
بیٹی	رضیہ بٹ	۱۶/-	
باجی	"	۱۷/-	

اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ گھر کی چیز باہر پھینک آئیں۔ وہ ایک پڑھے لکھے گھر میں رہتے ہیں۔

بہر کیف پڑوسن کے مقابلے پر تو ہمیں یہ چوہے بیگانے بالکل نہ لگتے۔ بلکہ تعلیم یافتہ ہی لگتے۔ ایک مرتبہ تو میں نے دیکھا کہ ایک چوہا میری لائبریری کا دیوانِ غالب سامنے رکھے مطالعہ کر رہا تھا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ اس دیوان غالب کے نسخے کے کئی صفحے اور اشعار کترے ہوئے تھے۔ چوہے نے صرف وہی اشعار کترے جو اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ ویسے تو وہی شعر ہماری بھی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

اور پھر وہ کترا ہوا دیوان غالب میں نے ایک پبلک لائبریری کو دان میں دیا تھا۔ کیونکہ ان کی طرف سے دان کی ایک اپیل شائع کی گئی تھی۔

مگر ایک مرتبہ تو مجھے ان چوہوں پر بے اختیار پیار آگیا۔ دو چور ہماری دیوار پھاند کر صحن میں گھس آئے۔ اس وقت ہماری دادی اماں اپنے پلنگ سے کمالِ فن سے کھانس رہی تھیں۔ مگر چوروں نے دادی کی کھانسی پر مائنڈ MIND نہیں کیا اور تالہ توڑنے لگے۔ مگر اندر چوہوں نے کراکری توڑ کر نیچے زور سے گرانا شروع کر دی تھی تو چور یہ سوچ کر پلٹ گئے کہ اندر تو چوروں کا کوئی اور گروہ گھسا ہوا ہے۔ ان دونوں چور بڑے ڈیموکریٹ تھے۔ یعنی دوسرے چور کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔

ہمارے گھر میں ان چوہوں نے تو مستقل گھونسلے بنا رکھے تھے اور باقی چڑیاں ویسے ہی ہمارے گھر کی اسٹڈی کے لئے کبھی کبھی آنکلتیں۔ ان بیرونی وزیٹرں سے ہمارے جذباتی تعلقات بھی بیلنس ہیں۔ اگر چہ گھر کے ایک دو ننھے بچے

انھیں گا گا کر بلاتے بھی کہ

آجا چڑیا ، آجا چڑیا
دانا دنکا کھا جا چڑیا

مگر وہ کبھی ننھوں کے ہاتھ نہیں آئیں۔ انھیں معصوموں پر کبھی اعتبار نہیں آیا۔ اگرچہ ننھے بھی معصوم تھے اور چڑیاں بھی۔ لیکن چڑیاں شاید سوچتیں کہ معصوم ہوئے تو کیا ہوا، ہیں تو صرف انسان کی اولاد اور انسان سے ہی وہ یہ مصرع سن چکی تھیں کہ :-

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

ہمارے گھر میں جو دو مستقل چڑیاں تھیں۔ اُن میں سے ایک نے لکشمی دیوی کی تصویر کے پیچھے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ دوسری نے عمر خیام کے پیچھے۔ دونوں اپنے گھونسلوں میں برابر تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھتیں۔ عمر خیام والی چڑیا کبھی کبھی اداس ہو کر تصویر کے فریم پر آبیٹھتی ـــ نہ جانے اُسے کیا غم تھا جسے بار بار بچے پیدا کرنے کے باوجود غم غلط نہیں کر سکی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا کہ اولاد اُڑنا سیکھتے ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی۔ لہٰذا جونہی کبھی ہمارے ریڈیو سیٹ پر میرا بائی کا کوئی بھگتی رس میں ڈوبا ہوا گیت بج رہا ہوتا۔ وہ تصویر کے کنارے آبیٹھتی، اور پلکیں بند کر کے سننے لگتی۔ لیکن حیرت تھی کہ وہ بچے بھی پیدا کئے جاتی اور بیراگ کے گیت بھی سنے جاتی۔ بچاری دو عملی کا شکار تھی۔

مگر لکشمی کی تصویر والی چڑیا، بیحد چنچل تھی۔ ہر وقت پھدکنا، کودنا۔ اپنی طاقت سے کچھ زیادہ بے باک تھی۔ سبھی سہیلیوں کو لے آتی تھی۔ کئی ایک سے تو چار چار چونچیں بھی لڑ ملتی تھی۔ پنجے پر اکثر جان پہچان والیوں کو بھی لے آتی اور بڑا

اور صمم میانی ـــــ میری بیوی پر وٹسٹ کرتی ۔ میں اس کنجری کا گھونسلہ توڑ دوں گی۔ یہ بہت سر چڑھ گئی ہے۔ کل چائے کا ایک کپ گرا کر توڑ دیا منحوس نے ؟"

لیکن والد صاحب کہتے دد بیٹی اشرق میں آئے ہوئے جیو کو باہر نہیں نکالنا چاہیئے۔ اور پھر یہ تو لکشمی دیوی کے شرن میں رہتی ہے۔ کون جانے ہیں اسی کی دعا سے لکشمی دیوی دوقعے دے رہی ہو۔"

میں سوچتا تھا نہ جانے یہ چڑیا پچھلے جنم میں ہماری کیا لگتی تھی۔ یا ممکن ہے کوئی بالکل نیا رشتہ استوار کر رہی ہو۔ لیکن وہ حرکت وحرارت سے بھرپور زندگی گزار رہی تھی۔ اس لیے مجھے تو فرانس کی ماتا ہری لگتی تھی۔

لیکن اس کے مقابلے پر ہماری بکری تھی جو والد صاحب نے ایک ساربان سے لی تھی۔ ساربان کی دلوی کے کفن کے لیے ہمارے دادا صاحب نے روپے قرض دیئے تھے۔ بعد میں روپے ادا نہ ہو سکے۔ جو عام طور پر نہیں ہوتے۔ تو والد صاحب اس سے کفن کے روپوں کی بجائے بکری لے آئے۔ اسے اقتصادی نظام میں بارٹر سسٹم کہا جاتا ہے۔ بہرکیف پہلے ساربان کے بچے اس کا دودھ پیتے تھے اب ہمارے بچے پینے لگے۔ دودھ وہی تھا، صرف بچے بدل گئے۔ بکری کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کا دودھ کس کے بچے پی رہے ہیں۔ اس کے لیے دنیا کے سبھی بچے برابر ہوتے ہیں مگر یہ بکری کا نقطۂ نگاہ تھا انسان کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں اور بکری صرف مخلوقات۔

ساربان کے بچے کبھی اسے راہ جاتے دیکھ لیتے تو کہتے " یہ ہماری بکری ہے"

مگر ایک بار ہمارے ایک مجاہد قسم کے بچے نے یہ فقرہ سن لیا تو اُس نے ساربان کے بچوں کو ایسا پیٹا کہ بعد میں وہ اشارہ بھی نہ کرتے صرف دور سے چپ چاپ بکری کو دیکھ کر تسکین حاصل کر لیتے۔

ایک دن بڑے بھائی صاحب نے کہا "قبلہ والد صاحب! یہ بکری اب بوڑھی ہو چلی ہے۔ اسے آزاد کر دیا جائے"۔ مگر والد صاحب نے کہا۔ "کفن کے روپے ابھی پورے نہیں ہوئے"۔

بھائی بولے "جب پورے ہوں گے کیا جب آزاد کر دیں گے"۔

والد صاحب کا جواب تھا۔ "نہیں اسی ساربان کو واپس کر دیں گے"۔

والد صاحب ٹھیک کہتے تھے، اس فانی دنیا میں یہ دستور ہے کہ جو چیز جہاں سے آتی ہے، بالآخر وہیں واپس پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ہماری بھینس کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ والدہ صاحبہ کا دعویٰ تھا کہ یہ بھینس انھیں جہیز میں ملی تھی مگر والد صاحب کا بیان تھا کہ جس دن یہ جہیز میں آئی تھی اُسی رات ڈاکو اُسے چرا کر لے گئے تھے اور وہ انہیں دو سو روپے دے کر چھڑا کر لائے ہیں۔ بہرکیف اس بھینس پر بزرگوں میں اختلاف رائے تھا۔ بلکہ کئی بار خانہ جنگی کا باعث بھی بنا لیکن بھینس اپنی پوزیشن کبھی واضح نہیں کرتی تھی پچھلے جنم میں کوئی ڈپلومیٹ رہی ہوگی۔

ایک چھپیر تلے اُس کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ مگر وہ کچھ اس قسم کی سرونٹ تھی کہ ہماری خدمت کم کرتی تھی، ہم سے خدمت زیادہ کرواتی تھی۔ یعنی اسے کھلانا، پلانا، نہلانا، ٹہلانا، ہسپتال لے جانا، وضع حمل پر نرسنگ کروانا، بگڑ جائے تو

منانا۔ یہ غلط ہے کہ بھینس میں عقل نہیں ہوتی۔ وہ ہماری بھینس کو دیکھیے، سارے گھر کو بیوقوف بنائے ہوئے تھی۔ گھر کا ہر فرد اس کا نوکر تھا اور وہ خود کسی صوبے کا گورنر معلوم ہوتی تھی۔

جب آخری مہینوں میں بھینس کا دودھ کم ہو جاتا تو والد صاحب اُسے ڈنڈوں سے پیٹا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا "قبلہ! آپ اسے کیوں پیٹتے ہیں۔"

وہ بولے "دراصل پچھلے جنم میں یہ میری بیوی تھی۔ میں شریف تھا اس لیے یہ بات بے بات مجھے ڈنڈوں سے پیٹا کرتی تھی۔ بھگوان کا کرنا کیا ہوا کہ موجودہ جنم میں وہ ہماری بھینس بن گئی اور میں اسے ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر پچھلے جنم کی بے عزتی کا انتقام لیا کرتا ہوں۔"

لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ بھینس بھی بڑی عقلمند تھی۔ ڈنڈے کھاتی تو انتقاماً اپنا دودھ بھی تھنوں میں اوپر چڑھا لیتی۔ ہمیں بوند بوند کو ترسا دیتی۔ اس لیے کہ جب بھی کبھی تھوڑا بہت دودھ نکلتا والد صاحب اس میں پانی ملا کر کمی پوری کر دیتے۔ ایک مرتبہ وہ تین چار دن تک دودھ چڑھائے رہی۔ پانچویں دن دودھ کی دھاریں نکلیں تو دودھ عام مقدار سے کچھ زیادہ نکلا۔ میں نے والد صاحب سے کہا "اس مرتبہ اس کا دودھ زیادہ تو ہے مگر پتلا بہت ہے۔"

والد صاحب مسکرا کر بولے "لگتا ہے یہ سالی اب ہم سے زیادہ عقلمند ہو گئی ہے۔ اپنے دودھ میں خود ہی پانی ملا دیتی ہے۔"

ان چوروں کے نام ——— !

جو انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہیں ●●

مسئلہ ایک بوڑھے کا

اور پھر یوں ہوا کہ گردشِ عیش کی حسیناؤں نے مجھے انکل کہنا شروع کر دیا۔ میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ یہ گمراہ ہو گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ راہِ راست پر آ جائیں گی۔ لیکن دن، مہینے، سال دو سال — آخر مجھے کفِ افسوس مل کر خود ہی تسلیم کرنا پڑا کہ میں اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔ آہ! مجھے ان حسیناؤں سے کتنی خوشگوار امیدیں تھیں، سبھی غارت ہو گئیں۔

اگر خود اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم نہ کرتا تو ایک اور خطرہ تھا کہ کسی دن میری بیوی بھی مجھے انکل نہ پکار بیٹھے۔ کیونکہ وہ زمانہ خلق کو نقارۂ خدا سمجھنے کی عادی تھی۔ اور یوں بھی وہ کچھ دنوں سے خاوند کی بجائے خدا کی پرستش کرنے لگی تھی اور آہ! جب اپنی بیوی ہی گمراہ ہو جائے تو دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ چارد ناچار میں نے لفظ " انکل " کو اپنی شخصیت کا جزو بنا لیا اور یوں سمجھ لیا جیسے انکل میرا تخلص ہو۔ جیسے کچھ شاعر اپنا تخلص رکھ لیتے ہیں تو لوگ نہ صرف اس کے تخلص کو برداشت کر لیتے ہیں بلکہ خود شاعر کو برداشت کر لیتے ہیں۔

لیکن بوڑھا ڈیکلیر ہوتے ہی میرے لیے ایک سنجیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یعنی گھر کے افراد نے اعلان کر دیا کہ اب آپ کو صرف REST (ریسٹ) کرنا چاہیے۔ آپ کے اعضائے رئیسہ یہی تقاضہ کرتے ہیں۔ مگر جب مجھے تاؤ آگیا۔ اور کہا۔ " آپ کو کیا حق ہے مجھے کام کرنے سے روکیں۔ "

وہ بولے " حق نہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ آپ کو کوئی کام نہ کرنے دیں۔ "

لیکن میں نے مسلسل ضد کی تو وہ بولے " تو پھر آپ صرف وہی کام کیجیے جو بے ضرر ہو۔ "

میں نے پوچھا۔ " مثلاً ؟ "

" مثلاً خدا کی عبادت شروع کر دیجیے۔ "

میں نے کہا " یہ کام میں نے عمر بھر نہیں کیا تو اب عبادت کر کے لوگوں کے سامنے شرمندہ کیوں ہوں، اور اس کے علاوہ میری بیوی خدا کی عبادت کرتی ہے اور بیوی جو بھی کام کرے اُسے ضرر رساں سمجھتا ہوں۔

غرض مجھے ایسے کئی کام بتائے گئے جو اُن کے خیال میں بے ضرر تھے مگر میں انھیں تضیع اوقات سمجھتا تھا۔ تو گھر کے وہ افراد بھی جو میرے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اشک افشاں ہو گئے۔ چنانچہ میں بھی گلوگیر ہو گیا۔ گلوگیری انسان کی سب سے

بڑی مصیبت ہے - جذبات زندہ ہوں تو لیک سو سال پرانی قبروں میں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں - چنانچہ جبراً و قہراً میں نے وعدہ کر لیا کہ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جسے نہ آپ چاہتے ہوں نہ ڈاکٹر - اور صرف وہی کام کروں گا، جو بے معنی ہوں گے ان میں معنی میں خود پیدا کر لوں گا۔

یہ سن کر سب نے داد کی بجائے تالی بجائی میں نے اکثر دیکھا ہے کہ مشاعرے میں جو غزل ترنم سے پڑھی جائے تو مفہوم چاہے اس میں صدیوں کا رگیدا ہوا ہو وہ مشاعرہ لوٹ لیتی ہے۔

وعدے کے دوسرے دن صبح جب میں بیدار ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھ میں نئی تازگی آگئی ہے - دنیا کا ہر بڈھا ہر نئی صبح یہی محسوس کرتا ہے کہ آج میں کل سے زیادہ بہتر ہوں - اور پھر آج میرے سر پہ کام کا کوئی بوجھ بھی نہیں تھا - نہ گھر کا - نہ سماج کا جو چاہوں گا کروں گا - بلکہ اگر نہ چاہوں گا اور پھر بھی کروں گا ..... تو اور بھی زیادہ بہتر رہے گا - وقت میرے اختیار میں ہے - میں اُسے کاٹوں گا، وہ مجھے نہیں کاٹے گا۔

اب کیا کروں ؟ کھانا، پینا، رہنا، پہننا، جیسے یہ سب چیزیں کام کے بغیر میسّر ہوں اُسے معاشرے میں حرام خور کہا جاتا اور میں حرام خوری کو بدعت سمجھتا ہوں گھڑی کی سوئیاں چل رہی ہیں کیوں کہ انہیں چابی دے دی گئی ہے - مگر میں نے اپنے آپ کو چابی نہیں دی ہے ـــ صبح کی چائے پیتے پیتے میں نے کہا "فکر تونسوی! تیری چابی کہاں ہے؟ اُسے تلاش کرو۔

میں نے بیگم کو آواز دی "بیگم! ذرا ادھر تشریف لائیے۔"

جواب آیا۔ میں برتن مانجھنے والی ملازمہ کو گالیاں دے رہی ہوں۔ بے حد مصروف ہوں۔ کیا آپ چائے پی چکے ہیں؟"

گویا میری بیوی ایک سماجی کام کر رہی ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ملازمہ کو گالیاں دینے کا کام میں اپنے ذمہ لے لوں۔ زندگی بھر جس کام سے پرہیز کرتا رہا وہی کرنے لگوں تو کیا حرج ہے۔ بے ضرر سا کام ہے۔ میرا وقت بھی کٹ جائے گا۔

لیکن۔ اس کام کی مناپلی MONOPOLY تو ہمیشہ بیوی کے پاس رہی ہے۔ اور اس دور میں اپنی مناپلی کون چھوڑتا ہے۔ لہٰذا یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس کی بجائے سوچا کیوں نہ چائے میں تھوڑا سا نمک ڈال لوں۔ اس سے چائے لذیذ ہو جائے گی۔ کیا نمک لانے کے لئے کسی کو آواز دوں؟ نہیں وقت کی خاصی مقدار میرے پاس موجود ہے۔ خود ہی کچن میں کیوں نہ چلا جاؤں۔ اور کچن میں جا کر نمک کا ڈبہ ڈھونڈنے لگا۔ دکھائی نہیں دیا۔ بڑی بہو بولی۔

"کیا چاہیئے پتاجی!"

میں نے کہا۔

"چائے میں نمک ڈالنا چاہتا ہوں۔ ذرا لذیذ ہو جائے گی۔"

وہ بولی "تو آپ نے خود کیوں زحمت فرمائی۔ مجھے حکم دیتے، میں لا دیتی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے نمک کے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے کہا۔

"رک جاؤ۔ مجھے بھی تو کوئی کام کرنا چاہیئے۔ اور سنو۔ یہ اندر مٹا کیوں رو رہا ہے؟"

وہ بولی "منا دودھ کے لیے چیخ رہا ہے۔ مگر میں دودھ کی بوتل تیار کر رہی ہوں۔"

میں نے بزرگانہ دھمکی سے کہا "کمال ہے، منا گھنٹہ بھر سے رو رہا ہے، تم اس کی ماں ہو، برداشت کر سکتی ہو، مگر میں نہیں کر سکتا۔ منا کیا سوچے گا۔ کہ میرا دادا کیا مر گیا ہے۔ جانتی ہو اسے بڑا ہو کر یہاں باپ کا نام روشن کرنا ہے ادھر لاؤ دودھ کی بوتل۔ میں خود اسے جا کر پلاتا ہوں۔"

بہو شرم و حیا سے بھیگ گئی۔ لاکھ کہتی رہی۔ گھر والے برا مانیں گے۔ مجھے جھڑکیاں ملیں گی۔ لیکن جو آدمی وقت کے ہاتھوں کاٹا گیا ہو۔ وہ بھلائی برائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لئے زبردستی بوتل لے کر منے حضور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مگر منا اپنی ماں کی بجائے میرے ہاتھ میں دودھ کی بوتل دیکھ کر اور بھی زیادہ ہائے وائے بلند کرنے لگا۔ میں نے اسے پچکارا، بہلایا، پھسلایا، ایک فلمی گانا تک سنایا۔ یہ سوگند تک کھائی کہ آج دودھ میں پانی نہیں ملایا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اور دادا کی بجائے ممی ممی پکارنے لگا۔ آخر میری آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد، ممی ہی اسے سیدھے راستے پر لے آئی، میں شرمندہ نہیں ہوا۔ بلکہ اسے جنریشن گیپ سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔ جس کی بدولت کم از کم میرے وقت کا آدھا گھنٹہ تو کامیابی سے بھگت گیا۔

لیکن اس کے بعد دل میں ایک ناگفتہ بہ قسم کی لہر ابھری کہ کہیں اس گھر میں میں ایک اجنبی کی طرح تو نہیں رہ گیا۔ اس تکلیف دہ لہر کے ساتھ ساتھ، ڈرائینگ روم کی طرف جاتے جاتے، بیوی کو آواز دی۔ میری عینک کہاں ہے۔ مجھے

آج کا اخبار پڑھنا ہے۔"

وہ بولی۔ "عینک آپ کی آنکھوں پر ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ عینک میری نہیں، تمہاری ہے۔"

"نہیں، آپ کی ہے۔"

"نہیں، تمہاری ہے۔"

وہ شاید ڈاکٹر کو بلانے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھی مگر میں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔ "جانِ من! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ کیا اب میں تم سے مذاق بھی نہیں کر سکتا؟"

اور پھر جاتے جاتے مجھے فرش پر ایک نوکیلا پن PIN دکھائی دیا۔ آہ! اگر یہ کسی بچے کے ملائم ہاتھوں میں چبھ جاتا تو کتنا لہو بہہ نکلتا۔ چنانچہ بڑی احتیاط سے میں نے وہ پن اٹھایا اور جا کر ڈسٹ بن DUSTBIN میں پھینک آیا۔ مگر دیکھا، ڈسٹ بن کے پہلو میں ایک نیا ٹوتھ برش پڑا ہے۔ سوچا، اس گھر میں غیر ذمے داری کے جراثیم کس حد تک پھیل گئے ہیں۔ کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں رکھی جاتی جہاں نہانے کا صابن رکھنا چاہیے وہاں ماچس رکھ دی جاتی ہے اور چائے کا خالی کپ ردی اخباروں کے ڈھیر میں پڑا ہونا ہے۔ جیسے یہ کپ نہ ہو، ردی اخبار یا خالی بوتل ہو۔ سوچا، اب مجھے اس گھر کو منصوبہ بند بنانا پڑے گا۔ آج کل منصوبے کے بغیر تو کوئی سوئی بھی نہیں ہل سکتی۔

چنانچہ دن بھر منصوبہ بندی کا کام کرتا رہا۔ قالین پر پڑی گیند کو اٹھا لیا۔

کہ یہ قالین پر ایک داغ سا لگتی ہے۔ کپڑے پریس کرنے والی دھوبن آئی تو اٹھ کر سبھی کپڑے دیکھے، شمار کیے، کیا پریس ٹھیک کر کے لائی ہے؟ کسی قمیض کا بٹن تو توڑ کر نہیں لائی

درمیانے پوتے سے کہا۔

"تمہارے ساتھ چڑی چھکا کھیلوں گا۔"

وہ خوش ہو گیا۔ کیونکہ پوتے اور دادا کی ایک پیرا ایلم تھی۔ کہ وقت زیادہ ہے۔ کیسے کاٹا جائے؟ پائیں باغ کے پودوں کو پانی سے تر بتر کر دیا۔ حالانکہ چند منٹ پہلے مالی انہیں تر بتر کر گیا تھا۔ مگر میں نے سوچا کہ مالی کا پانی صرف رسمی ہوتا ہے۔ میرے پانی کی کوالٹی زیادہ بہتر ہے۔

غرض یوں وقت کا بھگتان بڑے خلوص سے کرتے تھے شام ہو گئی تو میں ریسٹ rest کرنے کے لیے پلنگ پر جا لیٹا تو میری بیوی تشریف لے آئی۔ بولی۔

"کل میرے بھتیجے کی سگائی ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

میں نے کہا "میں نہیں چل سکتا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے بڑا مصروف آدمی ہوں۔"

وہ بولی "کون سی مصروفیت ہے؟"

تم دیکھ نہیں رہی کتنے کام کیے ہیں؟"

وہ بولی "ہنہہ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتے رہے"

سیّاح گائیڈ

میں نے غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایک گائیڈ تیار کی ہے۔ امید ہے اسے پڑھ کر اہلِ ذوق داد دیں گے ۔ اہلِ تہذیب ناک چڑھائیں گے ۔

او بدیش سے آنے والے سیّاح! ۔ سُن۔ کہ ہمارے دیش کی ایک تہذیب ہے۔ تہذیب کی ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ ہر ملک میں ہوتی ہے ۔ ٹریجڈی نمبر دو۔ یہ کہ الگ الگ ہوتی ہے، مثلاً جوتا ہے ۔ ہر ملک میں جوتا ہوتا ہے مگر ہر ملک میں جوتے کی تہذیب الگ الگ ہوتی ہے ۔ ہمارے ہاں جوتا پہن کر چوکے میں جانا بُرا سمجھا جاتا ہے ۔ تمہارے ہاں جوتا پہن کر ڈنر کھانا "ایٹی کیٹ" مانا جاتا ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہوتے تو جوتا اتار دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد سے جوتا چرائے بھی ہیں ۔ دراصل ہماری تہذیب بڑی وسیع المشرب ہے۔ ایک مشرب جوتا اتارنا۔ ایک مشرب جوتا چرانا ۔۔۔ دونوں ایک ہی تہذیب کے مشرب ہیں ۔ ایک تہذیب

— وسیع المشرب —!

یہی وجہ ہے کہ ہماری تہذیب امر ہے۔ اس نے اپنے خنجر سے کبھی خودکشی نہیں کی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم جتنے خنجر بناتے ہیں، وہ نقلی ہوتے ہیں۔ اُن سے خودکشی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے یہاں جتنی خودکشیاں کی گئیں، وہ ناکام رہیں — ہم کامیاب خودکشیوں کا چانس ہی نہیں آنے دیتے۔

پیارے سیاح! تم یہاں آئے ہو تو اپنے جوتے پر نگاہ رکھنا۔ میرا مطلب ہے یہاں اسے اتارا بھی جائے گا، چرایا بھی جائے گا۔ اپنا ایٹی کیٹ برتو گے اور چرچ کے میں جوتا پہن کر لنچ کھانے لگو گے تو میزبان برا مانے گا۔ ہو سکتا ہے وہی جوتا تمہارے سر پر چلا دے۔ یہاں جوتے کے کئی رول ہوتے ہیں، جوتا اتارنا، جوتا چرانا، جوتا مارنا، جوتے کو بھگونا۔ جوتے بغل میں دبا کر بھاگ جانا ....

میرا مطلب ہے صرف ہماری تہذیب ہی وسیع المشرب نہیں، جوتا بھی بڑا وسیع المشرب ہے۔

اور پیارے سیاح! تم ہندوستان میں آؤ گے تو یہاں کی دیواروں پر جگہ جگہ ایسے پوسٹر چسپاں پاؤ گے جن پر سنہری حروف میں لکھا ہو گا — "ہم بدیشی یاتریوں کا تہہ دل سے سواگت کرتے ہیں گے" مگر تم پوسٹروں پر مت جانا۔ ہم پوسٹروں کی وجہ سے سواگت نہیں کرتے۔ بلکہ دل سے سواگت کرتے ہیں۔ پوسٹر تو ہم فقط اس لیے چھاپتے ہیں تاکہ ہماری چھاپہ خانہ انڈسٹری چلتی رہے۔ کئی چھاپہ خانے ایک ہزار پوسٹر چھاپتے ہیں، تو پانچ ہزار پوسٹروں کا بل وصول کرتے ہیں۔ جبکہ ایک چھاپہ خانے کا مالک تو ایسے بل وصول کرتے کرتے ممبر پارلیمنٹ بن گیا تھا۔ اور

پارلیمنٹ نے تالیوں کی گونج میں اس کا سواگت کیا تھا۔ ہماری بڑی وسیع المشرب پارلیمنٹ ہے۔

بہرکیف سیاح جی! پوسٹروں پر مت جانا۔ ہم تم سے عشق کریں گے۔ کاغذی پروپیگنڈہ سے نہیں۔ ہمارے عاشق پوسٹر چھاپ کر اعلان نہیں کرتے کہ اے محبوبا ہم تم سے عشق کرتے ہیں۔ فلاں تاریخ کو کار لے کر آئیں گے اور تمہیں بھگا کر لے جائیں گے۔

— نہیں ہم چوری چھپے عشق کے قائل ہیں۔ کئی بار اپنے عشق کو اتنا چوری رکھتے ہیں کہ محبوبہ تک کو علم نہیں ہونے دیتے۔ حتیٰ کہ محبوبہ شادی کر لیتی ہے (کسی اور سے) بال بچے ہو جاتے ہیں۔ عاشق بھی شادی کر لیتا ہے (کسی اور سے) بال بچے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان کا وصال قبرستان میں ہوتا ہے۔ قبرستان کے وصال میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ وہاں دونوں کے ماں باپ کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔

ہاں مسٹر سیاح! تم بھی یہاں آکر اپنے عشق کو پھونک پھونک کر رکھنا۔ اوّل تو سر بازار کسی لڑکی سے اظہارِ عشق مت کر بیٹھنا۔ کیونکہ ہمارے یہاں اسے فعلِ بد سمجھا جاتا ہے۔ اظہارِ عشق کرو گے تو لڑکی بُرا ماننے کی ممکن ہے سینڈل بھی اتار کر تڑاتڑ عرض کر دے۔ سینڈل کی کوالٹی گھٹیا نکلی (جس کا امکان زیادہ ہے) تو وہ گالیاں دینے لگے گی۔ گالیاں سینڈل بیچنے والے کو دے گی۔ آپ سمجھیں گے، مجھ پر ارشاد فرمائی جا رہی ہیں۔ یہاں کی حسینائیں اسی طرح ایک سینڈل سے دو شکار کرتی ہیں۔

اسی طرح سیاح صاحب! مناسب اور بہتر یہی ہے کہ آپ کسی لڑکی کو دل نہ دے بیٹھیں۔ بلکہ سڑک پر کھڑے ہو کر کسی سکوٹر، ٹیکسی، تانگے والے کو آواز دیں۔

اندر پڑھیئے

۱۔ ہندوستان میں چور
۲۔ اوماں اور بھارت ماں
۳۔ میرے گھر کے جانور
۴۔ مسئلہ ایک بوڑھے کا
۵۔ سیاح گائیڈ
۶۔ قریب قریب
۷۔ راہ میں چلتے چلتے
۸۔ کہانی میرے پوتے کی
۹۔ چور کے نام دوسرا خط
۱۰۔ آج کی نگریات
۱۱ صبح کا اخبار
۱۲۔ یہ بچہ کس کا ہے
۱۳۔ کچھ آنکھوں کے بارے میں
۱۴۔ مندروں کا مال
۱۵ مہنگائی الاؤنس کا پتھر
۱۶۔ اخبار پڑھنا بند
۱۷۔ کوئی پتھر سے نہ مارے
۱۸۔ باتیں میں گھات
۱۹۔ گھری گھری
۲۰۔ پانی میں ملاوٹ
۲۱۔ نکتہ چینی کرتا ہے
۲۲۔ میرے ایک دوست ہیں

اسے اپنے ملک کا سگریٹ پیش کریں۔ وہ کورنش بجالائے گا۔ ہم لوگ امپورٹڈ چیزوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ چاہے وہ سگریٹ ہو، قمیض ہو، شراب ہو یا ریزر بلیڈ ہو یا عاشق ہو۔

میں نے امپورٹڈ شراب کی ایک بوتل پر ایک آدمی کو اپنی بیاہتا عورت کو دائو پر لگاتے دیکھا۔ بہرکیف آپ سکوٹر ڈرائیور سے کہیں "چلے گا۔"

"جی چلے گا۔ مگر کہاں چلے گا۔ پچاس روپے فی گھنٹے والا مال، ڈیڑھ سو والا یا پانچ سو روپے فل نائٹ والا۔"

"مگر میرے پاس تو غیر ملکی سکہ ہے۔

"ڈونٹ وری صاحب! بھنا دے گا۔

"کیا وہ ہم سے عشق کرے گا؟"

"جی کرے گا۔ مگر ہی ہی ہی، ذرا چوری چھپے۔"

"چوری چھپے کیوں؟"

"صاحب! چوری یہاں کا دھرم ہے۔ آپ سے چوری چھپے سکہ لے گا۔ چوری چھپے بھنائے گا، چوری چھپے دلالی کرے گا، چوری چھپے کمیشن لے گا، چوری چھپے ہوٹل میں اکاموڈیشن دلائے گا، چوری چھپے وہ چھوکری عشق کرے گا۔ چوری چھپے ڈیوٹی کانسٹیبل کا منہ پیسے سے بند کرے گا۔ پیسہ، مگر صاحب! پیسہ پہلے۔"

"ہم پیسہ پہلے دے گا۔"

"پہلے دے گا تو چھوکری ضرور عشق کرے گا۔ اس کا ماں بھی کرے گا، باپ بھی کرے گا۔ ہی ہی ہی!"

"ہی ہی ہی، تم بہت اچھا آدمی ہے۔"

"ہاں صاحب! اچھا کیا ہے، ہم تو خادم ہے، بدیشی سیاح کی خاطر تواضع کرتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے، دل سے سواگت کرتا ہے۔ آپ نے دیوار کا پوسٹر نہیں پڑھا! بیٹھ، بیٹھ، سکوٹر پہ بیٹھ! چل میرے سکوٹر! لے اللہ کا نام ملیں گے دام۔ ارے تیرا کیا کہنا۔

تو اے عظیم سیاح! اس دیش میں تمہیں پھونک پھونک کر ہر شئے کی سیر کرنی چاہیئے۔ تاج محل کی بھی محبوبہ کی بھی۔ اور ہمارے تہذیبی تقاضے کے مطابق کرنی چاہیئے۔ محبوبہ تمہیں مل جائے گی۔ سربازار عشق کروگے تو سینڈل مارے گی۔ پانچسو روپے دوگے تو سینڈل نہیں مارے گی، بلکہ اپنی زلفوں کی چھاؤں بچھا کر گنگناتے ہوئے کہے گی۔ پیارے سیاح! تم کہاں تھے، میں تو جنم جنم سے تمہاری پیاس لئے پھرتی تھی۔

اور اگر تم خدانخواستہ کہیں کہہ دو گے "اے عزیزہ من! کیا تم مجھ سے عشق کرو گی۔"

"عمر بھر کروں گی۔"

"عمر بھر کیسے؟"

"پہلے تم مجھ سے شادی کر لو پھر......؟"

ہاں سیاح صاحب! ہماری تہذیب میں شادی پہلے کرتے ہیں، عشق بعد میں۔ لہٰذا یہاں عشق بھی سوچ سمجھ کر کرنا، کیونکہ یہ راستہ سیدھا بیاہ منڈپ کی طرف جاتا ہے۔

گذشتہ اتوار کو میں نے غیر ملکی سیاح حضرات کو گائیڈ کیا تھا کہ جب یہاں آئیں

توان لڑکیوں کی سیاحت سے گریز کریں جو تول تول کر عشق کرتی ہیں۔ اور بالآخر عشق صادق کے لیے یہ شرط لگا دیتی ہیں کہ مجھ سے شادی کرلو ۔۔ یہاں کے اہلِ ذوق میں (جن میں لڑکیاں بھی شامل ہیں) امپورٹڈ چیزوں کا بڑا شوق ہے ۔ امپورٹڈ بلیڈ، امپورٹڈ گھڑی، امپورٹڈ خاوند۔

سیاح حضرات! میرا خیال ہے۔ آپ بھی اہلِ ذوق ہیں۔ مثلاً آپ کو یہ ذوق اس ملک میں کھینچ لایا کہ یہاں کے تاریخی مقامات کی سیر کریں گے۔ تاریخ کی ٹریجڈی یہ ہے (اور ہر ملک میں ہے) کہ جتنے تاریخی مقامات ہوتے ہیں۔ انھیں بادشاہ ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ کوئی لال قلعہ، کوئی اشوک کی لاٹ، کوئی تاج محل، کوئی مندر، کوئی مسجد، کوئی قطب مینار، کوئی توپ، حتیٰ کہ کوئی کھنڈر تک۔

۔۔۔ اور چونکہ ان سے بادشاہ وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ تاریخ میں عوام کیا چھوڑ جاتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ کوئی جھونپڑی، کوئی گھڑا، کوئی رکابی، کچھ آہیں، کچھ فریادیں ۔۔۔ چونکہ یہ اشیا تاریخ میں کوئی یادگار اور دلکش اضافہ نہیں کرتیں۔ اس لیے انہیں محفوظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ بلکہ ہر آنے والا حملہ آور بادشاہ انہیں تاخت و تاراج ہی کرتا ہے۔ اور اُن پر اپنا جھنڈا لہرا دیتا ہے۔

آپ بھی اُن تاریخی مقامات کی سیر ضرور کریں گے اور اسی ڈر اور شرم کے مارے کریں گے کہ کہیں آپ کے ملک والے آپ سے یہ نہ پوچھ بیٹھیں کہ کیا آپ نے تاج محل دیکھا تھا، جاگھو کا مندر دیکھا تھا ۔۔۔ آپ ان تاریخی مقامات کی فوٹو کھینچیں گے۔ اگرچہ ایسے کئی پوزوں کے فوٹو آپ کو یہاں پچیس پچیس پیسے میں مل جائیں گے۔ یہ تاریخی مقام کب اور کیوں بنائے گئے تھے۔ اس کی معلومات آپ کو محکمہ ٹورازم کی طرف سے چھاپے ہوئے

کتابچوں میں مل جائیں گے۔ یہ معلومات سرکار کی طرف سے منظور شدہ ہوں گی جب سرکار بدلتی ہے تو معلومات بھی بدلتی ہیں۔ کتابچے بھی بدلتے ہیں۔ اگرچہ یہ بدلی ہوئی معلومات بھی منظور شدہ ہوتی ہیں۔ ہر سرکار کی ہر تاریخی مقام کے متعلق اپنی ہی الگ الگ معلومات ہوتی ہیں۔

اس لیے سیاح حضرات! اگر آپ کا ذوق صرف معلومات حاصل کرنے تک محدود ہے تو آپ کو تاریخی مقامات تک جانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ میں تو کہتا ہوں۔ اس ملک میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کتابچے اور فوٹو یہاں سے منگا لیتے اور وہیں گھر بیٹھے ہی ہندوستان کی سیاحت پر ایک مبسوط کتاب لکھ ڈالتے اور ہندوستان والے اس کتاب کو بڑے چاؤ سے پڑھتے۔ کیونکہ جیسا میں نے کہا انہیں امپورٹڈ چیزوں پر زیادہ بھروسہ ہوتا ہے۔ اپنی تاریخ کے متعلق بھی انہیں امپورٹڈ کتاب پر زیادہ بھروسہ ہے۔

لیکن اگر آپ چشم دید معلومات حاصل کرنے کا چسکہ رکھتے ہیں تو ان تاریخی مقامات کی سیر اپنے پاؤں اور آنکھوں سے کیجئے۔ دھکے کھائیے، بھٹکیے، لیکن اس چشم دیدی کے لیے بھی آپ کو کچھ ہندوستانیوں پر انحصار ضرور کرنا پڑے گا۔ مثلاً کسی ٹورسٹ کمپنی کے پاس جانا پڑے گا۔ جو بزنس کی باتیں کم اور خدمت کی باتیں زیادہ کرے گی۔ سیاحت کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ ٹورسٹ کمپنی میں بزنس زیادہ اور خدمت کم کا اصول کارفرما رہا۔ مگر آپ کو اس اصول پر برا نہیں ماننا چاہیئے۔ کیونکہ سیاحت بھی ایک تجارت ہے۔ آپ کو معلومات کی بھوک ہے، ہمیں فارن ایکسچینج کی بھوک ہے ـــــ آپ یہاں کی تاریخ و تہذیب کا کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں

تو آپ کو اس کے عوض کچھ ادائیگی کرنا پڑے گی۔ صرف اتنی احتیاط رکھیئے کہ معلومات اس حد تک حاصل کیجیئے، جس حد تک آپ کی جیب اجازت دے۔ اپنے ملک کا واپسی کرایہ الگ بچا کر رکھ لیجیئے۔ اگر نہ بچایا تو آپ کے لیے دوہری مشکل پیدا ہو جائے گی۔ ایک تو آپ اپنے ملک میں واپس نہیں جا سکیں گے اور دوسرے یہاں قیام کریں گے تو نوکری نہیں ملے گی۔ اور ویسے ہی بھوکے مر جائیں گے۔

نوکری یہاں کے باشندوں کو نہیں ملتی تو سیاحوں کو کہاں ملے گی۔ جو سیاحت کے لیئے آتے ہیں حالانکہ یہاں کے باشندوں نے اپنے ملک ہی کی سیاحت نہیں کی۔ مگر پھر بھی انہیں نوکری نہیں ملتی۔ میں دہلی ہی کے کئی باشندوں کو جانتا ہوں۔ جو سالہا سال سے اس شہر میں رہ رہے ہیں۔ مگر انہوں نے قطب مینار تک نہیں دیکھا۔ وہ قطب مینار کی سیاحت کرنے سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ نوکری ڈھونڈتے رہیں۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے چکر لگاتے رہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ قطب مینار تو کبھی بھی ہاتھ آ سکتا ہے۔ لیکن نوکری تو کبھی کبھی ہاتھ آتی ہے۔ کئی بار ہاتھ میں آ کر بھی نکل جاتی ہے۔

سیاحت کے دوران آپ شاید یہ چاہیں گے کہ اس ملک کی نعمتوں کی سیاحت کریں۔ مثلاً آپ نے سن رکھا ہوگا کہ آم کا میوہ یہاں کی نعمت ہے اور شاید آم چوسنا بھی پسند کریں۔ لیکن معاف کیجیئے۔ آپ نے یہ تو صحیح سنا کہ یہاں آم کے درختوں پر آم لگتے ہیں مگر اس سننے کے بعد آم پر کیا بیتی ہے یہ آپ نے نہیں

شنا۔ مثلاً آپ آم کے درخت کے قریب جانا چاہیں گے۔ اوّل تو آپ کو اس کے قریب کوئی پھٹکنے نہیں دے گا۔ کیونکہ درخت پر ٹھیکہ داروں کا قبضہ ہوتا ہے۔ فطرت درخت اگاتی ہے۔ کوئی کنٹریکٹ سائن نہیں کرتی۔ درخت پر آم لگتا ہے۔ تو کنٹریکٹر اس کی بولی دے دیتا ہے۔ فطرت آپ کو درخت کے پاس جانے سے نہیں روکتی۔ کنٹریکٹر روکتا ہے۔ کنٹریکٹ اور فطرت میں بھی ایک فطری فرق ہے۔ مگر فرض کیجئے۔ ٹھیکیدار آپ کو سیاح سمجھ کر درخت دیکھنے کی اجازت دے دیتا ہے (سیاحوں کے متعلق ہمارے تاجر لوگ بھی بڑے فراخدل ہیں) تو آپ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ درخت موجود ہے۔ مگر اس پر آم موجود نہیں ہیں۔ آپ کنٹریکٹر سے پوچھتے ہیں۔ "جناب! آم کہاں گئے؟"

وہ کہے گا "ہم نے کچے کچے آم توڑ کر کولڈ سٹوریج میں رکھ لیے۔"

"پکنے کیوں نہیں دیئے ......"

"ابھی ہمیں جلدی تھی عرب ممالک سے ہمارے پاس آموں کا بہت بڑا آرڈر آیا ہوا تھا۔ ہم آموں کو کولڈ سٹوریج سے سیدھے عرب ممالک کو بھیج دیں گے۔"

آپ کہیں گے "مگر جناب! میں تو یہاں آم کا میوہ چکھنا چاہتا تھا۔ کہ دیکھوں یہ کتنے رسیلے اور شیریں ہوتے ہیں۔"

"سوری جی۔ یو سوری ٹھیکیدار نہیں کہے گا۔ میں کہہ رہا ہوں۔ کہ غلطی آپ سے ہوئی۔ آپ کو اگر ہندوستان کے آم چکھنا تھے تو آپ کو ہندوستان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بلکہ عرب ممالک میں جانا چاہیے تھا۔ ہندوستان کے آم عرب ممالک میں ملتے ہیں۔ درخت ہندوستان میں دیکھیے۔ آم عرب میں جا کر کھائیے ہم انٹرنیشنل تعلقات کو بڑھاوا دینے میں یقین رکھتے ہیں۔ کھدر کلچر پرچار کرتے ہیں۔ خود ولایتی لباس پہنتے ہیں۔ کھدر خود تیار کرتے ہیں۔ مگر اسے یورپ اور امریکہ میں لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔

قریب قریب

آج کل میں قریب قریب گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ قریب قریب کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کیونکہ جب سے پیسے کی تہذیب نے ہمارے سماج کو بنیادوں سے اکھیڑنا شروع کیا ہے ہر انسان قریب قریب ہی جی رہا ہے۔ پوری طرح کوئی نہیں جی رہا۔ کسی کا بھی کوئی منصوبہ پورا نہیں ہوتا۔ قریب قریب ہی پورا ہوتا ہے۔ بے اطمینانی کی ایک جونک ہے جو ہر فرد کا خون چوسے جا رہی ہے۔ میں نے ایک جونک سے پوچھا۔ "خون چوسنے کے بارے میں تمہاری کیا پوزیشن ہے؟"

وہ بولی۔ "قریب قریب ہی چوس پاتی ہوں۔ پوری طرح نہیں۔"

آپ کسی باپ سے اُس کے بیٹے کے بارے میں پوچھئے تو وہ پوری طرح نہیں بلکہ دو بٹہ تین ٹھنڈی آہیں بھر کر جواب دے گا۔ "ہاں صاحب! اُسے قریب قریب میرا بیٹا ہی سمجھئے۔"

گزشتہ دنوں ایک نوجوان کنوارے افسر نے دفتر کی چھٹی منزل سے چھلانگ مار کر خودکشی کر لی۔ بعد میں تحقیق پر معلوم ہوا کہ اُس کی محبوبہ نے ایک ایسے آدمی سے شادی کر لی تھی جو تیل کے چشموں والے ملک میں حیرت انگیز حد تک زیادہ تنخواہ پاتا تھا۔ گویا کنوارے افسر کی وہ محبوبہ قریب قریب ہی اس کی محبوبہ تھی۔ لہٰذا اُس نے ایک دن محبت کے مقابلے پر تیل کو ترجیح دی۔ تیل نے محبت کی قبر پہ دیا جلا دیا۔ اور یوں بھی دیئے میں پورا نہیں بلکہ قریب قریب ہو تو اس پر ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ بجھ جاتا ہے۔ خودکشی کر لیتا ہے۔

ہاں میں بھی گھر سے قریب قریب باہر نہیں نکلتا۔ قریب قریب اس لیے کہ میرے گھر کے سامنے ایک پارک ہے۔ جب کبھی مجھے خبر ملتی ہے کہ آج کالونی میں کوئی منسٹر یا ڈپٹی منسٹر آنے والا ہے تو پارک میں چہل قدمی کے لئے گھر سے نکل جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ آج پارک میں گھاس کی صاف ستھری کٹائی ہو چکی ہو گی۔ سیمنٹ کی بنچیں دھو دھلا کر چمکا دی گئی ہوں گی۔ اور پھول بھی کھلا دیئے گئے ہوں گے۔ وہ پھول زمین کی کوکھ کے بیٹے نہ ہوں۔ بازار سے رنگ برنگے کاغذ کے پھول لا کر سجا دیے گئے۔ صفائی۔ دھلائی۔ سجاوٹ ہر شئے زمین سے اُس وقت مانگتی ہے جب اس میں وزیر کا بیج ڈالا جائے۔ ورنہ عوام کا بیج جب بھی کہیں ڈالا گیا دھول مٹی ہی اگتے ہیں۔

چنانچہ ایک ایسی ہی مبارک شام کو جب ڈپٹی منسٹر صاحب اپنی گردن میں پھول مالائیں اور چند سرخ و سفید چمچے ڈال کر چلے گئے۔ تو میں پارک میں ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور تازہ ہوا سے اپنے گلے گزرے پھیپھڑوں کو خوش کرنے لگا۔

میرے پھیپھڑوں کے متعلق ڈاکٹروں کی پالیسی یہ تھی کہ انھیں تازہ ہوا سے تازہ رکھا جائے تو یہ قریب قریب چالو ہی رہیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ انسان جب تک پوری طرح انتقال نہ کر جائے اُسے اعضائے رئیسہ کو متحرک رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے تازہ ہوا سے۔ وزیر کے بھاشن سے نہیں۔

جب میں پھیپھڑوں کے ساتھ قریب قریب جعلسازی کر چکا تو جیب سے ایک سنگترہ نکال لیا۔ بجائی صحت کا شوق آپ کو سنگترے تک لے جاتا ہے۔ بازار میں سنگترے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قریب قریب اصلی ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو قریب قریب نقلی ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو نقلی سنگترہ اصلی سنگترے کے بھاؤ پر دیا گیا تو یہ دکاندار کا آرٹ ہے جو صبح اپنی دکان پر شوشنکر بھولے ناتھ کی تصویر پر پھول مالا ٹانگتا ہے۔ اور خوشبودار دھوپ جلا کر پوجا کرتا ہے۔ اگرچہ شوشنکر جانتا ہے کہ وہ بھی قریب قریب پوجا کر رہا ہے۔ پوری پوجا کرے تو اصلی اور نقلی سنگترے کے چکر میں نہیں پڑتا۔

بہرکیف جو سنگترہ لایا گیا تھا اُسے قریب قریب اصلی سمجھ کر لایا گیا تھا۔ اور جونہی میں اُسے چھیل کر پہلی پھانک کھانے لگا تھا کہ ایک دم کسی نے جھپٹا مارا۔ اور سنگترہ میرے ہاتھ کے بجائے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔

دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ مجھ سے تین چار گز کے فاصلے پر ایک بندر بیٹھا اُس سنگترے کا پریوگ کر رہا ہے۔ وہ بھی قریب قریب پریوگ کر رہا ہے کیونکہ ایک پھانک کو لے کر اس کا دو تہائی حصہ اپنے معدے میں دھکیل دیتا اور باقی ایک تہائی پھینک دیتا۔ پرایا مال ہو تو بندر میں بڑی فراخدلی آجاتی ہے۔

اپنا مال ہو تو ردی - رسالے اور اخبار تک سنبھال کر رکھتا ہے کہ انہیں بیچنے پر ایک کلو دیسی گھی نہیں تو ڈالڈا ہی آ جائے گا - جو قریب قریب گھی ہی کہا جاتا ہے -

میں نے بندر کی طرف گھورا نہیں - اُسے آنکھیں نہیں دکھائیں - ایک تو اس لیے کہ یہ ہمارا جدِ امجد ہے - اور دوسرے یہ کہ اگر اسے دھمکایا تو دانت نکال کر آپ پر غرائے گا - اور پھر جس گوریلا سٹائل میں اُس نے جھپٹ کر سنگترہ چھینا تھا اُس سے مجھے یوں لگا کہ یہ تو کوئی نکسلائٹ ہے -

مگر بندروں کے کردار کے متعلق تیسری جماعت میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ وہ آپ کی جو چیزیں چھین کر لے جائے بالکل ویسی ہی ایک چیز بندر کی طرف پھینک دیجئے - وہ جواب میں وہی چھینی ہوئی چیز آپ کی طرف واپس پھینک دے گا -

میں نے سوچا کہ اس کا مطلب ہے بندر بھی قریب قریب نکسلائٹ ہے - پورا نکسلائٹ نہیں ہے کیوں نہ بندر کے اس کردار سے فائدہ اٹھایا جائے - ہم انسان تو اپنے جدِ امجد سے بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں - یعنی اپنا قرض چکانے کے لیے قرض خواہ کو چیک کاٹ کر دیں تو وہ کیش نہیں ہوتا - اور پھر بندر کے متعلق میں آج صبح کے اخبار میں پڑھ چکا تھا کہ ایک سمگلر نے بندر کے پیٹ سے سونے کی چند ڈلیاں باندھ دیں - اور بندر چھلانگیں مارتا ہوا ایک ملک کی سرحد پار کر کے دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہو گیا - نہ کسٹم والوں کو کوئی شبہ ہوا - اور نہ بندر کو شبہ ہوا کہ اُسے سمگلر اپنے مقصد کے لیے ایکسپلائٹ کر رہا ہے -

ہمارے جدِ امجد کی خرد ماغی کی انتہا ہے -

۲۲۔ آج کا پروگرام
۲۴۔ انتقال، انتقال، انتقال
۲۵۔ اوپر عرش، نیچے فرش
۲۶۔ ہاں، میں ہاں ملانا
۲۷۔ ایک ناخوشگوار مکالمہ
۲۸۔ نو بچوں کا باپ
۲۹۔ برہمن سے ہریجن تک
۳۰۔ گوشہ نشیں باہر نکلا
۳۱۔ جناوہ کا امتحانی پرچہ
۳۲۔ چور کی مصیبت
۳۳۔ ننگی عورت
۳۴۔ مجھے قتل کردو
۳۵۔ جانوروں کے نام کو لیٹر
۳۶۔ پیسے کی تہذیب
۳۷۔ عالم و فاضل لوگ
۲۸۔ اُوٹ پٹانگ

بہر کیف میں نے بھی اس کہانی کی تقلید کی۔ اور جیب سے ایک دوسرا سنگترہ نکال کر بندر کی طرف پھینکا۔ مگر بندر نے .....

آہ! قارئین کرام۔ بندر نے وہ دوسرا سنگترہ بھی اٹھا لیا۔ اور دونوں سنگترے دبوچ کر پارک سے چھلانگیں لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے پیچھے سے اُسے آواز دی ــــ "جناب جدِ امجد! آپ کے کردار میں یہ تبدیلی کیوں آگئی ہے۔؟"

اُس نے ٹیڑی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "میں اس سمگلر کا سدھایا ہوا ہوں۔ لہٰذا مجھے بھی بندر نہیں، قریب قریب سمگلر ہی سمجھیے۔"

راہ میں چلتے چلتے

راہ میں چلتے چلتے — کہیں ٹھوکر لگ جائے۔ کہیں پھول پکار اٹھیں۔ کہیں بارش جاگ پڑے۔ کہیں لیڈر بھاشن دیتے دیتے بھول جائے کہ اُسے آگے کیا کہنا ہے۔ کہیں ٹرک کسی کار سے ٹکرا جائے اور ٹرک ڈرائیور ڈر کے مارے بھاگ جائے اور یہ دیکھے ہی نہیں کہ کار کو تو ذرا سا گزند بھی نہیں پہنچا۔ ہاں، اسی طرح راہ میں چلتے چلتے مجھے گھاسی رام جی مل گئے۔ وہ دم لینے کے لیے ہانپ رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "گھاسی رام جی! خیریت تو ہے؟"

وہ بولا۔ "یار! تھک کر چور چور ہو گیا ہوں"

"کیا دمے کا مرض لاحق ہو گیا؟"

"نہیں پیارے بادہ جو بھارت بند ہوا تھا نا اُس کے پوسٹر پڑھتے پڑھتے تھک گیا۔"

میں نے تفصیل سے اُس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بحث تھکے ہوئے آدمی کو شریں نہیں لگتی۔ مگر راہ میں چلتے چلتے اور برائے ہوٹل کے باہر تین چار آدمی کھڑے تھے۔ اور زور زور سے ایشائی کھیلوں کے ایک پل گرنے پر بحث کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ ہوٹل سے مرغن لنچ کھا کر نکلے تھے ــــ پل گر گیا۔ شیم شیم شیم! ــــ ایشائی کھیلیں ــــ مُردہ باد!

"مُردہ باد کیوں صاحب! کیا آپ جن سنگھی ہیں؟"

"نہیں صاحب! جن سنگھی تو میرے والد صاحب تھے۔ میں تو شریف آدمی ہوں۔ لیکن دیکھئے، یہ سب وقت اور روپے اور محنت کی بربادی ہے۔ جبکہ ہمارے دیش کے نوے فی صدی لوگ انتہائی غریبی کی نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔"

"مگر گھاسی رام جی! یہ ہوٹل اور ریسٹ ہاؤس، شہر دہلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چار چاند لگا دیں گے۔ چلئے آپ کو بنارسی پان کھلاؤں۔"

تو یہ بھی گھاسی رام ہے۔ ایک گھاسی پوسٹر پڑھ پڑھ کر تھک گیا۔ ایک مُرغ کے بعد پان کھا رہا ہے۔ راہ میں چلتے چلتے مجھے ایک اور گھاسی رام بھی ملا تھا۔ جو ایک زیرِ تعمیر عمارت کی اینٹیں سر پر اٹھا اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ وہ بھی تھکا ماندہ لگتا تھا۔ یوں لگا۔ دہلی میں سبھی گھاسی رام رہتے ہیں۔ اور سبھی تھکے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ایک سے نام کیوں رکھتے ہیں۔ بدل کیوں نہیں لیتے۔ تھکے ہوئے کیوں ہیں۔ ایک بہت بڑے دولتمند نے مجھے کل راہ میں چلتے چلتے بتایا تھا۔ کہ ہمارے دیش کے لوگ کڑی سے کڑی محنت سے بھی نہیں گھبراتے۔ محنت کے معاملے میں

ہمارا دیش دنیا بھر کے سبھی دیشوں سے فوقیت لے گیا ہے۔ وہ یہ بات ایمبیسڈر کار میں بیٹھا کہہ رہا تھا، بیک وقت پستہ کھانے اور کھانسنے میں مصروف تھا۔ میں نے پوچھا "ہندوستانی محنت کشوں کے متعلق آپ کے تجربات کافی ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ کمیونسٹ ہیں۔"

"تھا کسی زمانے میں ۔۔۔ اب تو میرے پاس کار اور کوٹھی ہے۔ اب کمیونسٹ بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر ہمارے گھریلو نوکر کی کمال محنت دیکھو، ایک گھنٹے میں میری اس میلی کچیلی کار کو شیشے کی طرح شفاف کر دیا۔ کون کر سکتا ہے اتنی جان توڑ محنت؟"

میں نے جواب دیا "گھاسی رام؟"

ششدر ہو کر بولے۔ "مگر گھاسی رام تو میرا نام ہے ۔۔۔ جی۔ آر۔ ہنچندہ"

میں نے پوچھا ۔۔ "آپ کے گھریلو نوکر کا کیا نام ہے۔"

"البتہ اُس کا نام گھاسی رام ہے۔"

"نہیں، اُس کا نام جی۔ آر۔ ہنچندہ ہے۔"

اُسے شاید میری بات پسند نہیں آئی..... کار سے سر باہر نکال کر نفرت سے تھوکا۔ تھوک قریب سے گزرتے ایک بھکاری پر پڑی۔ صدیوں سے اس پر سماج کی تھوکیں پڑ رہی ہیں۔ مگر وہ مائنڈ نہیں کرتا۔ کار سے باہر نکلتے ہوئے سر پر ایک چڑیا نے بیٹ کر دی۔ بھکاری اور تھوک، چڑیا اور بیٹ۔ راہ میں چلتے چلتے بڑے مضحکہ خیز مناظر نظر آتے ہیں۔ ایک کی بجائے دو پستے منہ میں ڈال کر وہ ڈرائیور سے بولا۔ "چلو، لانڈری کلب۔"

راہ میں چلتے چلتے جو ڈی۔ٹی۔سی بس جا رہی ہے۔جو سکوٹر، کاریں اور منی بسیں جا رہی ہیں۔وہ سبھی روڈ ٹری کلب نہیں جا رہی ہیں۔ایک صاحب بس پر چڑھتے چڑھتے گر گئے۔فحش گالیاں دینے لگے۔ان کی پتلون پھٹ گئی۔گھٹنے سے خون بہہ نکلا۔میں جلدی جلدی اُس کے پاس چلا گیا "جناب! جلدی جلدی کرن بیکا ڈپٹی کمشنر ٹرانسپورٹ کو فون کیجیے۔وہ مسافروں کی مرہم پٹی کے لیے آپ کو ہسپتال لے جائے گی۔"

وہ بولا "میں خود بھی ہسپتال جا رہا تھا۔میرے بھتیجے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔"

"کیا وہ بھی بس سے گرا تھا؟"

"جی نہیں۔صحبت بد میں پڑ گیا تھا۔جوا کھیلنے کی عادت پڑ گئی تھی۔پولیس نے چھاپہ مارا۔تو وہ ڈر کے مارے دیوار پھلانگنے لگا تو ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

میں اُسے مشورہ دینا چاہتا تھا کہ جوا کھیلنا ہو تو بڑی بڑی کلبوں میں جا کر کھیلو بڑی محفوظ جگہ ہے۔بلکہ تھانے میں بیٹھ کر کھیلو محفوظ ترین جگہ ہے۔مگر راہ میں چلتے چلتے کسی کو صحیح اور نیک مشورہ دیا جائے تو وہ آپ کی نیت پر شک کرنے لگتا ہے۔شہر میں سب سے بڑی اور سب سے نئی آفت بدنیتی کا پھیلاؤ ہے۔کچھ یوں کہ بدنیت آدمی بھی دوسرے کی نیت پر شک کرنے لگتا ہے۔باہمی اعتماد کی بے لوث طاقت جو ہمارے ملک کی ضمیر میں تھی اُس سے ہم محروم ہو چکے ہیں۔کہ سچ بولنے والا بھی سچ کہنے سے کتراتا ہے، ڈرتا ہے کہ کوئی اُسے جھوٹا سمجھ کر ناجائز شراب بیچنے کے جرم میں ڈنڈے نہ لگوا دے کیونکہ پولیس کا ڈنڈا ہر گھٹنوں اور

راست گفتاروں دونوں پر ایک ہی ضرب سے پڑتا ہے۔

راہ میں چلتے چلتے میں نے دیکھا۔ ایک شخص ایک دکان کے باہر زار و قطار رو رہا ہے۔ آنکھوں سے چھم چھم آنسو گر رہے ہیں، مگر ایک آنکھ سے گر رہے ہیں۔ دوسری آنکھ پتھر کی ہے۔ میں نے پوچھا کس کی بدنیتی پہ رو رہے ہو؟ اپنی یا دوسرے کی؟

"اس دکاندار کی۔ کل میں نے واٹر کولر کی قیمت پوچھی تو سولہ سو روپے بتا رہا تھا۔ مگر آج خریدنے آیا تو سترہ سو روپے مانگتا ہے۔"

"ایک دن میں ایک سو روپے کی ٹوٹ کھسوٹ؟ تیرا کہنا کیا ہے؟"

"کہتا ہے نئے سال کا بجٹ آرہا ہے اس لیے مارکیٹ میں قیمت بڑھ گئی ہے۔"

راہ میں چلتے چلتے میں نے اُس کی خوش نصیبی کی تعریف کی۔ کہ خدا کا شکر کرو کہ تمہاری صرف ایک آنکھ ہے۔ اگر دوسری پتھر کی نہ ہوتی تو تمہیں کولر کے ایک سو روپے کی بجائے دو سو روپے دینے پڑتے۔

وہ رونے کی بجائے ہنسنے لگا۔ نہ جانے آنکھ پر، بجٹ پر، مہنگائی پر یا دکاندار کی اس نیت پر جو دکانداری کرتے کرتے کھوٹی ہو گئی تھی۔

کہانی میرے پوتے کی

میرا ایک پوتا ہے ۔ ہر وہ انسان دادا کہلانے لگتا ہے، جس کا پوتا وجود میں آجائے۔ ورنہ پوتے سے پہلے وہ خاصی معقول زندگی گزار رہا ہوتا ہے معقولیت میں اس کی بیوی بھی شامل ہوتی ہے اور پڑوسنیں بھی۔ بلکہ پڑوسنیں بیوی سے زیادہ معقول لگتی ہیں۔

میرے پوتے کا نام پنکج ہے۔ بہت سے لوگ اپنے بیٹوں کا نام سبھاش اور جواہر لال رکھتے ہیں۔ ارادہ ان کا یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہو کر سبھاش چندر اور جواہر لال نہرو بنیں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں، میرے ایک دوست کے بیٹے کا نام سبھاش رکھا گیا تھا، وہ آج کل بائیسکل رکشا پلر ہے۔ دوسرے ایک ہمسائے کا بیٹا جواہر لال نامی تھا۔ وہ لوئر ڈویژن کلرک ہے۔ سیب خریدنے سے پہلے سو بار سوچتا ہے کہ کیا سیب کے مقابلے پر کوئی لوئر ڈویژن پھل نہیں ہے جسے

کھاتے ہوئے وہ کلرک نہ لگے۔ ہاؤسنگ منسٹری کا ڈپٹی سیکرٹری نہ لگے۔

میرے پوتے کا نہیں، بلکہ پوتے کے نام کا مستقبل کیا ہے؟ میں نہیں جانتا۔ میرے والدین نے بھی میرا نام اپنی کی طرح رومانٹک اور سیقانہ نہیں رکھا تھا۔ وہ بھی نہیں جانتے تھے کہ میں بڑا ہو کر شاعر یا ادیب بنوں گا۔ اور یہ کہ وہ عمر بھر ماتھا پیٹا کریں گے کہ ہمارا نصیبہ ہی خراب تھا کہ ہمارا بیٹا رائٹر بن گیا۔ کیوں ڈپٹی یا تاجر نہیں بنا۔

میرا پوتا کنڈرگارٹن (کے جی) میں پڑھتا ہے۔ کل ایک دھوبن جو ہمارے کپڑے پریس کرتی ہے بڑے دردناک لہجہ میں کہنے لگی "بابو جی! میرا بچہ میونسپل پرائمری اسکول کی دوسری جماعت میں پڑھتا ہے مگر اسے ابھی تک گنتی بھی نہیں آتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے بھی کے جی والے انگریزی اسکول میں داخل کرا دوں۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں! انگلش میڈیم والے پبلک اسکول میں داخل کرا دو۔ بڑا ہو کر تمہارا بیٹا آئی اے ایس بن جائے گا۔"

"آئی اے ایس کیا ہوتا ہے جی؟"

"جو اپنے کپڑے تمہارے جیسے دھوبیوں سے پریس کرواتے ہیں۔"

ہمارے بڑے شہروں کے متوسط اور اونچے طبقے میں یہ ایک وبا پھیلتی جا رہی ہے کہ بچے کو پبلک اسکول میں پڑھاؤ۔ بڑا ہو کر وہ قوم پر حکومت کرے گا۔ میونسپل سکولوں میں پڑھاؤ گے تو وہ بڑا ہو کر صرف ووٹ دینے والا ووٹر عوام بن کر رہ جائے گا ـــ چنانچہ یہ وبا ہمارے ملک میں دو نئے طبقے پیدا کر رہی ہے۔
(۱) حاکم طبقہ (۲) حاکم کو سلام کرنے والا طبقہ۔

یہ وبا آگے بڑھ کر دکھائے گی کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اگر پبلک سکولوں کی اس تجارت بازی کو ان کا جمہوری حق ہی مانا جاتا رہے۔ تو میرا خیال ہے، بالآخر ایک دن ایسا آئے گا جب ہندوستان کا ہر فرد حاکم ہوگا۔ عوام غائب ہو جائیں گے۔ سنا ہے، تجارت میں کبھی کبھی اسے زبردست گھاٹے بھی پڑ جاتے ہیں جو تاریخ میں نام پاتے ہیں۔

میرے پوتے نے گزشتہ دنوں ایک پولیس افسر کو دیکھا۔ جہیز کے خلاف عورتوں اور مردوں کا ایک جلوس جا رہا تھا۔ وہ پولیس افسر جلوس کے ساتھ ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے بندوق لٹکی ہوئی تھی ـــــ میرے پوتے نے پوچھا "دادا جی! یہ پولیس افسر اپنے ساتھ بندوق کیوں لے جا رہا ہے"

میں نے کہا "یہ کہ موقع مناسب دیکھ کر یہ جلوس پر بندوق چلا دے۔"

وہ بولا "مگر آپ تو کہتے تھے، بندوق چوروں اور ڈاکوؤں پر چلائی جاتی ہے۔ کیا یہ جلوس والے چور ہیں۔"

میرے پوتے کو علم نہیں کہ جہیز کیا مصیبت ناگہانی ہے۔ اور نہ اسے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی جلوس کسی بھی وقت بندوق کی گولی کا نشانہ کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ اس لیے میں نے اُسے خاموش رہنے کے لیے کہا "چپ رہو گھر چل کر تمہیں بتاؤں گا۔"

مگر وہ خاموش رہنا نہیں چاہتا تھا لگتا تھا پولیس افسر کی بندوق اُسے بڑی پسند آگئی ہے۔ چنانچہ مجھ سے کہنے لگا "دادا جی! مجھے بھی ایسی بندوق لے دو۔"

میں نے پوچھا "لے دوں گا مگر کیا کرو گے اُسے۔"

وہ بولا "میں بھی گولی ماروں گا۔"

"کس کو؟"

"آپ کو۔"

مجھے بے اختیار ہنسی بھی آئی اور بے اختیار اذیت بھی ــــ اور مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بڑی فیکٹری کا مزدور ہوں اور دوسرے مزدوروں کے ساتھ فیکٹری کے بند آہنی دروازے پر خشت باری کر رہا ہوں کہ دن بدن بڑھتی مہنگائی کے باعث ہمارا بھتہ بڑھایا جائے۔ اتنے میں میرا پوتا، پولیس افسر بن کر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں گن ہے۔ اور وہ اس سے حفظِ امن کے نام پر گولی چلا دیتا ہے کیونکہ.....

.....کیونکہ کل رات کے جی کے قاعدے میں پڑھ رہا تھا۔ "جی فار گن! جی فار گن۔"

میرے پوتے پنکج کی آنکھیں نیلی ہیں۔ مجھے دنیا کی ہر نیلگوں چیز پسند ہے۔ اس لیے مجھے بھی اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی شعر سوجھ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "دادا جان! میری آنکھیں نیلی کیوں ہیں؟"

میں نے کہا "بیٹا! بالکل یہی سوال آسمان نے خدا سے پوچھا تھا۔ تو اس سے بھی کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔"

وہ بولا "خدا کہاں رہتا ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا۔"

میں نے کہا "وہ تمہاری نیلی آنکھوں میں رہتا ہے۔"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، وہ تیزی سے دوڑا۔ چونگا اٹھایا۔ کہنے لگا۔ "ہیلو! کون صاحب بول رہے ہیں؟"

نہ جانے ادھر سے کیا جواب آیا۔ میرا پوتا اس سے کہنے لگا۔ "سوری،

ہندوستان میں چور

ہندوستان میں چوری کے متعلق ایک لطیفہ بہت مقبول ہے کہ ایک گھر میں چوری ہو گئی۔ تحقیق و تفتیش کے لیے وہاں پولیس آ گئی۔ پولیس افسر نے گھر مالک سے پوچھا "ہاں جی، بتائیے گھر میں کون کون سی چیزیں چوری ہو گئیں؟"

گھر کے مالک نے ان اشیاء کی فہرست لکھوانا شروع کر دی۔ پولیس افسر نے غصے میں کہا "مگر یہ چیزیں تو گھر میں میرے سامنے موجود ہیں۔ چور تو نہیں لے گئے؟"

گھر کے مالک نے کہا "جناب! آدھی چیزیں تو چور لے گئے، باقی آدھی آپ پولیس والے لے جائیں گے۔" مجھے ایک خوش پوش آدمی نے بتایا کہ چور اور پولیس میں صرف ایک فرق ہوتا ہے کہ پولیس والا وردی پہنتا ہے، چور وردی نہیں پہنتا۔ بہرکیف ہندوستانی باشندے کسی چور پر آبدیدہ اور افسردہ نہیں ہوتے۔ بلکہ چوری کو مزاحیہ رنگ دے کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

رانگ نمبر! ہمارا نمبر ڈبل سکس، سیون، نائن، زیرو فائیو ہے" اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "دادا جی! یہ رانگ نمبر پر ٹیلیفون کی گھنٹی کیوں بج اٹھتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بیٹا! ٹیلیفون کا ایک خدا ہے کمیونی کیشن سینٹر! یہ رانگ نمبر کی گھنٹی وہی خدا بجاتا ہے۔"

چور کے نام دوسرا خط

پیارے چور جی!

شاید آپ میری اس بات کو غلط بیانی قرار دیں کہ میں آپ کو پہلے بھی ایک خط بھیج چکا ہوں۔ اور یہ دوسرا خط ہے۔ مگر معاف کرنا۔ غلط بیانیاں کرنا لیڈروں کا پیشہ ہے۔ میرے اور تمہارے ایسے عزت دار لوگوں کا کام نہیں (میں آپ کو عزت دار اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کل سوسائٹی میں چوروں کو ہی عزت دار کہا جاتا ہے)

ہاں، میں نے آج بیس برس پہلے ایک خط لکھا تھا، مگر آپ کو نہیں بلکہ آپ کے والد صاحب کو جو شہر کے مشہور چور تھے۔ شاید اُن کی وصیت کے مطابق آپ بھی چور بن گئے۔ پرانے زمانے میں بھی یہی سیدھا سادھا دستور تھا کہ بڑھئی کا بیٹا بڑھئی بن جاتا تھا۔ نائی کا بیٹا نائی۔ اور چور کا بیٹا چور ــــ اس سے ایک تو

لہو صاف رہتا ہے۔ باپ کا لہو بیٹے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے بڑھئی، نائی اور چور کی کوالٹی میں گراوٹ نہیں آتی۔

چند برس پہلے ایک دولت مند دکاندار نے دس ہزار روپے رشوت (دان) دے کر اپنے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا۔ دوکاندار کا بیٹا ڈاکٹر تو بن گیا مگر اب ایک چھوٹے سے چوبی کھوکھے میں پریکٹس کرتا ہے۔ کبھی ایک آدھ مریض اس کے ہتھے چڑھ گیا تو اُسے مار دیتا ہے۔ ورنہ انسانوں کی بجائے مکھیاں مارتا رہتا ہے۔

ہاں۔ میں نے پہلا خط آپ کے والد صاحب کو لکھا تھا۔ دوسرا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے خاندانی روایت کی لاج رکھی اور چور بن گئے۔ ایک تو اس سے آپ کے رگھو کل ریت میں ملاوٹ نہیں ہو پائی۔ اور دوسرے اگر ملاوٹ ہو جاتی۔ تو آپ بھی اُس ڈاکٹر کی طرح مکھیاں مارا کرتے۔ بہرکیف شکر کیجئے۔ کہ چور بننے سے آبروئے شیوۂ اہل وزداں قائم رہ گئی۔

جب آپ کے چور والد صاحب نے میری جیب کاٹی تھی۔ تو میں نے انہیں شرم دلائی تھی کہ ایک لیکھک کی جیب کترنے سے آپ کو کیا ملا؟ — ایک ڈائری جس میں ٹیلیفون نمبر درج تھے۔ اور یا پھر دانتوں کے منجن کا ایک نسخہ اُس میں لکھا تھا۔ اُس نسخے کے مسلسل استعمال کا انجام یہ ہوا کہ ڈاکٹر ادم پرکاش ڈھلہ ڈینٹل سرجن کو میرے سارے دانت نکالنے پڑے۔

البتہ اُس ڈائری میں میری ایک محبوبہ کا فوٹو بھی تھا۔ لیکن اب وہ فوٹو

بے معنی ہو چکا تھا۔ اُس سے نہ مجھے فائدہ تھا نہ چندر کو۔ کیونکہ اس محبوبہ نے بے وفائی کر کے مجھ سے شادی کر لی تھی۔

اور اب آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ تو بھی اس لیے کہ آپ بھی والد صاحب کی تقلید میں ادیبوں کی جیب کا تعاقب چھوڑ دیجیے کیونکہ گزشتہ دنوں آپ نے میرے ایک ادیب دوست کی جیب کاٹی تو اُس میں بھی آپ نے صرف تین روپے چالیس پیسے برآمد کیے (چالیس پیسے زمین پر گر گئے تھے جنھیں آپ نے اٹھانا تضیع اوقات سمجھا) اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی پاکٹ بک جس میں اس کی چند غزلیں تحریر کی ہوئی تھیں۔ اور معاف کرنا چندر جی! آپ حد سے زیادہ نالائق اور بد بخت ہیں۔ کہ وہ غزلیں اردو زبان میں تھیں۔ جو ایک راندۂ درگاہ زبان رہ گئی ہے۔ ان غزلوں کو بڑے بڑے وزیر تک نہیں پڑھ سکتے تو آپ ایسا نکھٹو چندر کیا پڑھے گا۔ میرا مطلب ہے اردو شعروادب سے تو صرف وہی حضرات بھتہ کھا پی رہے ہیں۔ جو سرکار کی خوشہ چینی کو ہی ادبِ عالیہ گردانتے ہیں۔ خوشہ چینی جب ادب عالیہ بنی ہے۔ تو چوری فن عالیہ کہلانے لگتی ہے۔

لیکن آپ نے اس ادیب کی جیب کتری لیکن فن عالیہ کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کل فن عالیہ کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر فن میں بھس وغیرہ بھر کر اُس پر میڈ اِن امریکہ کا رنگ۔ دآہنگ والا چمکیلا لیبل لگا دیا جاتا ہے اور مارکیٹ میں دُگنے دام پر بیچ دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ بوٹ بنانے کا فن ہو یا افسانہ نگاری اور شاعری کا فن ہو۔ گاہک بیوقوف ہیں (جو عام ملتے ہیں) اور صرف چمک دمک پر مرتا ہو تو ہر طرح کا مال بک جاتا ہے۔

مگر معاف کرنا بیوقوف چورجی! اوّل تو تم کو فقط تین روپے ملے۔ کیونکہ وہ ادیب
کی جیب تھی۔ آئندہ کسی کی جیب صاف کرنا چاہو تو پہلے اس سے پوچھ لیا کرو۔ کہ تم
شاعر یا ادیب تو نہیں ہو ـــ چلو خیر! تم نے نہیں پوچھا۔ تو اُس سے اُس کی شاعری
کے معیار میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ نہ بڑھا نہ گھٹا۔ لیکن اے کندۂ ناتراش! تمہارے پلّے
کیا پڑا؟ صرف تین روپے؟ انسانوں کو ڈکار جانے والی اس مہنگائی کے زمانے میں تین
روپے کی وقعت ہی کیا ہے۔ کہ اُن سے تو تم سگریٹ کا ایک پیکٹ تک نہیں خرید
سکتے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اُس کی جیب سے امپورٹڈ سگریٹ کا ایک پیکٹ
چرا لیتے۔ جو اُس دن اس کے ایک مدّاح نے پیشِ خدمت کیا تھا۔ اس پیکٹ
کی قیمت آٹھ روپے تھی۔ اور وہ ان تین روپوں سے کئی گنا بہتر تھا۔

لیکن ان تین روپوں سے بھی کئی گنا حماقت تم سے یہ ہوئی کہ جب تم نے بلیڈ
چلایا تو وہ اُس کے سلکی کُرتے کو بھی چیرتا چلا گیا۔ تم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ کرتا کم از کم
ایک سو روپے کا تھا۔ جو چیرے جانے کے بعد ایک دمڑی کا بھی نہیں رہا۔ کم از کم تم
جیب کاٹنے سے پہلے تمہیں سماج اور سیاست اور علم اقتصادیات کے متعلق کافی
معلومات ہونی چاہیئے۔ یعنی تمہیں علم ہو کہ ایک غزل پچیس روپے میں بکتی ہے۔
تو ایک کرتہ سو روپے میں ملتا ہے تم نے وہ کرتہ چرایا نہیں لیکن اب وہ نہ اُس
ادیب کے کام کا رہا نہ آپ کے ـــ کیا یہ اس سے بہتر نہیں تھا کہ تم اُسے کسی اندھیرے
کونے میں لے جاتے اور اُس کا کرتا اتار لیتے اور نوادرات کی دکان پر جا کر یہ کہہ دیتے
کہ یہ کرتہ کلاسیکل کرتہ ہے جسے میر تقی میر پہنا کرتا تھا۔ نوادرات کی دکان والے
اگر اُسے ایک سو روپے میں نہ خریدتے پچاس ساٹھ روپے تو دے دیتے۔

اور میر کے کرتہ کے طور پر ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیتے۔

پیارے جورجی! افراط زر کے اس افراتفری کے دور میں حالات بے حد تشویشناک اور قدریں بیحد بدل گئی ہیں۔ اب تو لوگ لیڈروں پر جوتے تک نہیں پھینکتے۔ کیونکہ گھٹیا سے گھٹیا جوتا پچاس روپے میں آتا ہے اس لئے وہ جوتے کی قیمت لیڈر سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ چپ چاپ لیڈر کا لیکچر سُن لیتے ہیں مگر اپنا جوتا بچا لیتے ہیں ـــ لہٰذا تم جیب کتروں کو بھی اپنے فعل میں تبدیلی لانا چاہیئے۔ اور یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ کرتا جس پر ہم اپنا بلیڈ صرف کر رہے ہیں کتنی قیمت میں آیا ہوگا۔ کرتے کے پیچھے اگر پانچ چھ ہزار روپے مل جائیں تو جلد ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سبھی نوٹ جعلی نکل آئیں۔

بہر کیف آج کل کوئی بھی جرم کرنا ہو تو اس کے لیے سماجی شعور کا ہونا لازمی ہے۔

اور اب میرا خیال ہے تم اس ادیب کے دولت کدے پر چلے جاؤ جس کا نام "یدر کٹیا" ہے۔

اور اس سے جا کر کہو "صاحب آپ کا کرتہ یاد ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

نہ اگر کہے "مجھے معافی نہیں چاہیئے کرتا چاہیئے۔

تو تم جواب دو "جناب! کرتے کا ایک سو روپیہ تو ادا نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے کوئی اور سزا دیدیجئے۔ ایسی سزا جو سو روپے کی قیمت کے برابر ہو۔ مثلاً آپ مجھے اپنا افسانہ سُنا دیجئے۔ نہ صرف افسانہ سُنوں گا۔ بلکہ داد تک دے دوں گا۔"

اور جورجی! ممکن ہے وہ آپ کو یہ سزا دینے پر آمادہ ہو جائے۔ بلکہ شاید یہ بھی کہدے۔ کہ ایک افسانہ سے میری قیمت پوری نہیں ہوئی۔ دو افسانے سُنا دوں گا۔

آج کی فکریات

• ایک ودوان کتھا کرتے ہوئے کہہ رہا تھا — "ہمارے دھرم شاستروں میں کہا گیا ہے کہ انسان کو صرف پچیس برس کی عمر تک بھر پیٹ غذائیں کھانی چاہئیں۔ اُس کے بعد غذا کی مقدار کم کرتے چلے جانا چاہیے۔"

اچانک ایک شرودھالُو اٹھ کر بولا "مہاراج! ہم غریبوں کو تو پچیس برس تک بھی کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں ملا۔ تو ہمارے دھرم شاستروں کی کیا پالیسی ہے۔؟"

• ایک ملک کے ایک طاقتور فوجی نے دوسرے ملک کے طاقتور فوجی سے کہا۔

"اگر میں تمہیں قتل کردوں تو......؟"

"تو میں شہیدِ وطن کہلاؤں گا۔"

"اگر تم مجھے قتل کردو؟"

"تو تم شہیدِ وطن۔"

"اور اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو قتل کر دیں؟"
"تو دونوں شہیدِ وطن۔"
"اور اگر ہم دونوں انسانیت دکھائیں اور ایک دوسرے کے دوست بن جائیں؟"
"تو دونوں غدارِ وطن۔"

• عادت بُری بلا ہے۔ مثلاً جو شخص صرف اپنے آپ کو ہی ماننے کا عادی ہو اور کسی بھی دوسرے کو ماننے کا عادی نہ ہو۔ آخر ایک دن وہ اپنے آپ کو بھی ماننے سے انکار کر دے گا۔

• کسی سرکاری افسر کو رشوت دینے کے بعد عبادت خانے میں مت چلے جاؤ اور خدا سے یہ عرض داشت مت کرو کہ اے خدا! میرے اس گناہ کو معاف کر دینا۔ کیونکہ افسر اور خدا کی سانٹھ گانٹھ ہوتی ہے۔ خدا نے ہی اُسے رشوت لینے کے لیے تخلیق کیا تھا۔

• تم دنیا کے سامنے سو فیصد ڈاکو ہو مگر تمہارے اندر جو ڈاکو ہے وہ صرف پچاس فیصد ہے۔ اور تم خود نہیں بتا سکتے ہو کہ باقی جو پچاس فیصد ہے وہ ڈاکو کیوں نہیں ہے؟

• میرے عیب تمہارے عیب اس وقت بن جاتے ہیں۔ جب تم مجھ پر الزامات کی بارش شروع کر دو۔

• دو معصوم بھائی بہن ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ بہن پوچھ رہی تھی۔ "بھیا! ہمارے پتا جی نے جو اپنی زندگی کا بیمہ کروا رکھا ہے۔ وہ کیوں کروا رکھا ہے؟"
بھائی نے جواب دیا "اس لیے کہ جب پتا جی مریں گے۔ تو بیمہ کمپنی والے ہزاروں روپے ہمیں دے دیں گے۔"

"تو پتاجی کب مریں گے؟"

"ہائے، نہ جانے پتاجی کب مریں گے۔"

• لیڈر پر پتھر پھینکو تو فوٹو گرافر اکر فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ لیڈر کو پھول مالا پہناؤ تو فوٹو گرافر اکر تصویر اتار لیتا ہے۔ فوٹو گرافری کے فن میں پتھر اور پھول مالا کی زیادہ اہمیت ہے، لیڈر کی نہیں۔

• میں نے جب ہزاروں باتیں کیں، جب جا کر معلوم ہوا کہ میں نے ایک بات بھی کام کی نہیں کی۔

• جب میرے ایک پیارے اور گہرے دوست نے انتقال کیا۔ تو میں اس کے گھر تعزیت کے لیے نہیں گیا۔ کیونکہ میں اپنے دوست کو مری ہوئی حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

• میں چند منٹ کے لیے خاموش ہو جاتا ہوں تو میرے باطن میں ہزار ہا سرگرمیوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور ایک دم چیخ اٹھتا ہوں۔ یہی چیخ میری خاموشی کا سبب بن جاتی ہے۔

• پیغمبر دوسروں کا بھلا کرتے ہیں۔ مگر خود شہر سے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے نہیں۔

• مل جل کر رہو مگر بھری تنہا رہو کیونکہ وہ تنہائی ہی آپ کو وہ لطف عنایت کرتی ہے جو مل جل کر رہنے میں آپ ضائع کر دیتے ہیں۔

• بچہ ضد کرتا ہے۔ تو اسے طمانچہ مت لگاؤ کیونکہ وہ طمانچہ لگنے کے بعد دوسرے ذرائع اختیار کرے گا۔ اور اپنی ضد پوری کرے گا۔

• ہندوستان کے ایک آدمی کے اندر ستر کروڑ آدمی بسے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ایک

آدمی کل کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کے ستر کروڑ آدمی بے ایمان ہو چکے ہیں۔

"کیا آپ بھی اُن ستر کروڑ آدمیوں میں شامل ہیں؟"

"میں؟ میں تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہوں۔"

• چند ہفتے پہلے میرا ایک دوست بڑے فخر سے کہہ رہا تھا۔ بھگوان کی دیا سے اب مجھے کوئی چنتا نہیں میرے دونوں بیٹے نہایت اعلیٰ عہدوں پر ملازمت کر رہے ہیں۔ اور اب تو چاہے میں کینسر سے مر جاؤں۔ مجھے کوئی غم نہیں ہوگا۔"

گزشتہ ہفتے اُس کے دونوں بیٹے کینسر کا شکار ہو گئے۔ مگر اُن کا والد ابھی تک زندہ ہے۔

• اگر نماز پڑھتے وقت آپ کے دل و دماغ میں اناج۔ تیل۔ چاول اور چینی گھوم رہے ہیں تو یوں سمجھیے، وہ آپ کی نماز نہیں ہے بلکہ آپ کا راشن کارڈ ہے۔

• ایک صاحب روزانہ شیو کرتے تھے مگر پھر انھوں نے بڑی داڑھی رکھ لی۔ ایک اور صاحب داڑھی رکھا کرتے تھے مگر انھوں نے روزانہ شیو کرنا شروع کر دی۔

کیوں ——؟ کیونکہ دونوں کا مذہب خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اور مذہب ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے۔

• نرمل جل کی ایک ندی دیکھی تو ایک آدمی اتنا متاثر ہوا کہ فوراً دو گھونٹ پی کر پیٹ میں اتار دیئے۔ دوسرا آدمی نرمل جل کی ندی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔

نرمل ندی دونوں سے متاثر نہیں ہوئی۔ دھیرے دھیرے اُسی

ایک بوڑھے بابا نے جو ۱۸۵۷ء کے انقلابی غدر میں پیدا ہوئے تھے۔ (وہ انقلاب کو بھی ہندوستانیوں کا مذاق سمجھتے تھے) مجھ سے کہنے لگے۔ "ہائے! کیا واضح زمانہ تھا کہ جب چور دیواروں میں نقب لگا کر چوری کرتے تھے، یا کند لگا کر چوری کرتے تھے۔ تو نقب اور کند سے پہلے اللہ کا نام ضرور لیا کرتے تھے۔ اور اللہ کی برکت سے کامیاب ہو جاتے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "مگر بابا جی! کیا اب چور اللہ کا نام نہیں لیتے؟"

"نہیں جی! جب سے سائنس اور صنعت آئی ہے۔ اللہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے۔ مشین کا نام لیتے ہیں جس میں برکت ہوتی ہے۔ کیونکہ مشین، بڑے جادو اثر آلے، پرزے بنا لیتی ہے۔ چوران مشینی پرزوں اور چابیوں کے ساتھ کار پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ بڑے اطمینان سے دوسرے کے گھر کا ہر سائنٹیفک تالہ کھول کر اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اندر کا سارا قیمتی مال و اسباب اٹھا کر کار میں رکھ دیتے ہیں۔ اور یوں چلے جاتے ہیں۔ جیسے چوری کر کے نہ جا رہے ہوں، مکان شفٹ کر کے جا رہے ہوں۔"

میں نے چوروں کی اس نئی تکنیک پر داد کی تالی بجائی۔

بابا کو داد کی تالی پر رنج ہوا۔ بولے۔ "اجی تالی کیسی؟ یہ کوئی چوری تھوڑے ہوئی، حق حلال کی کمائی ہو گئی۔ جانتے ہیں آپ، یہ مشینی عہد کے چور کیا کرتے ہیں۔ کار سیدھی لے کر اُس دلال کے پاس جاتے ہیں۔ جو چوری کا مال خریدتا ہے۔ مال دیکھتے ہی وہ دام آدھے کر دیتا ہے۔"

"کیوں؟"

طرح بہتی رہی۔

• ایک اور بوڑھے نے تڑپ کر دعا مانگی "اے خدا اب مجھے موت ہی دے دے۔"

اور دو منٹ بعد موت نے آکر دستک دی "بابا جی میں حاضر ہوں۔"

بوڑھا گھبرا کر بولا۔ "مگر میں نے تو اپنے بیٹے کو بلایا تھا۔"

موت نے کہا "ہاں بابا! میں آپ کا بیٹا ہی ہوں۔"

یہ بچہ کس کا ہے؟

سبھی لوگ سوال کر رہے تھے۔ "یہ بچہ کس کا ہے؟" یہ سوال کچھ لوگوں کی زبان پر تھا۔ کچھ کے دل میں تھا، کچھ کے نہ زبان پر تھا نہ دل میں۔ بلکہ دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی سوال کر رہے تھے۔

ایک کنواری کالج سٹوڈنٹ نے اپنی بوسہ زلفوں کو جھٹکا دے کر بچے کی طرف دیکھا۔ اور پھر بے نیازی سے منہ پھیر لیا جیسے کہہ رہی ہو "یہ بچہ میرا نہیں ہے"

بچہ آٹھ نو برس کے پیٹے میں ہوگا۔ وہ لوکل بس کے اندر پتلے کمزور ہاتھوں سے آہنی ڈنڈے کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ادھ میلا اور ادھ پھٹا تھیلا تھا۔ چہرے اور لباس دونوں پر شکستگی، پھٹیچرپن، اداسی، بے بسی وغیرہ وغیرہ چھائی ہوئی تھی۔ میرے ساتھی نے میرے پہلو میں ہلکا سا ٹھوکا دے کر مجھ سے کہا۔ "نجانے بے چارا کس کا بچہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "نقش و نگار تو کہہ رہے ہیں کہ یہ بھارت ماں کا بچہ ہے۔"

بس میں مردوں اور عورتوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ بھیڑ بھاڑ میں دھکم پیل بھی شامل کر لی گئی تھی جس سے بھیڑ بھاڑ اور بھی زیادہ لگتی تھی۔ یہ بچہ انسانوں کے اس عادی ہجوم میں گھرا ہوا، پھنسا ہوا، اپنی موجودگی کو بڑی دقت سے تسلیم کرانے میں مصروف تھا۔ اونچے اونچے قد والے مردوں اور عورتوں میں وہ سب سے چھوٹا لگ رہا تھا — سب کا بچہ لگ رہا تھا — لیکن کوئی بھی اسے اپنا بچہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ باریش مہاشے بھی نہیں مان رہا تھا جو پانچ منٹ پہلے سنسکرت کا کوئی اشلوک پڑھ رہا تھا جس کا مطلب تھا۔ "بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔"

بس چلنے سے پہلے میں نے بس اسٹاپ پر اس بچے کو دیکھا۔ بس کے آتے ہی لوگ کتوں کی طرح بس پر جھپٹ پڑے تھے۔ کتا بننے میں اب کوئی عار نہیں رہی تھی۔ بلکہ جو کتا بس کو پکڑ لیتا۔ وہ اپنے آپ کو برنڈ بیج کتا سمجھتا تھا۔ بچہ بھی بس کی طرف لپکا تھا۔ اس کا سر ایک گرانڈیل سواری کی ٹانگوں میں پھنس گیا تھا۔ وہ چلایا بھی تھا مگر نقار خانے میں طوطی کی چلاہٹ سننے کا رواج نہیں تھا — وہ ٹانگیں بس کے اندر چلی گئیں۔ جن کے ساتھ بچے کا سر بھی اندر چلا گیا۔ ورنہ اسے کون چڑھنے دیتا تھا۔

آپا دھاپی میں ڈوبتا ابھرتا ہوا سماج۔ کسی بے بس کو کب آگے بڑھنے دیتا ہے۔ حالات کی ٹانگیں اسے کہیں نہ کہیں پہنچا دیتی ہیں۔

بس کے اندر بچے کو سیٹ نہیں ملی۔ کیونکہ سیٹیں مہلاؤں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں، بچوں کے لیے نہیں۔ اور پھر بچہ اپنی ماں کے ساتھ تھا سب اور جائز لگتا

ہے۔ ورنہ مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ اس بچے کو بھی مشکوک سمجھا گیا۔ کیوں کہ اس کے ساتھ اس کی ماں نہیں تھی اور مہلاؤں کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی مہلاؤں میں سے کوئی اس کی ماں بننا نہیں چاہتی تھی ایک صاحب نے ایک فلمی سٹائل کی مہلا سے کہا۔ "بیچارے اس بچے کو اپنے پہلو میں بٹھا لیجیے۔ ورنہ یہ غریب کچلا جائے گا۔"

حسین مہلا نے ناک سے کچھ سونگھا اور پھر ریشمی رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ سونگھنے کے عمل سے اس نے ثابت کر دیا کہ بچے کے جسم سے گندی بو آرہی ہے جبکہ میں نے صبح اپنے لیڈی لباس پر اسپ ٹنڈ عطر چھڑکا ہے۔

مہلاؤں کی سیٹ پر ایک موٹا مشٹنڈا آدمی براجمان تھا۔ اس نے گھٹنے پر گھٹنا رکھنے کا پوز جمانا چاہا تو اس کا بوٹ اس بچے کے ننگے پاؤں پر جا پڑا۔ بچہ بلبلا اٹھا ۔۔۔ مشٹنڈے نے ڈانٹا "ارے اندھا ہے۔ سیدھی طرح کھڑا کیوں نہیں ہوتا۔ دیکھ نہیں رہا تھا، میرا بوٹ ......"

میں نے اس سے کہا۔ "بچے کا پاؤں آپ کا بوٹ نہیں دیکھ سکا ۔۔۔ کیونکہ پاؤں کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔"

وہ سمجھا، شاید میں نے اس کے بوٹ کی سخت توہین کی ہے۔ بازو کی مچھلیاں پھڑکاتے ہوئے بولا "اجی آپ نہیں جانتے۔ ان جیب کترے لونڈوں کی آنکھیں وہ نہیں ہوتیں۔ پیسوں ہوتی ہیں۔"

دو تین آدمی جو اس بچے کے آگے پیچھے دھنسے ہوئے کھڑے تھے۔ جیب کترے کا لفظ سُن کر تین تین انچ پیچھے ہٹ گئے یوں لگا جیسے بچے کے کھڑے رہنے کی تنگ جگہ اچانک کھل گئی ہو۔ تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

ایک عورت نے اپنے بلاؤز میں رکھے ہوئے نقدی کے بٹوے کو ٹٹولا اور اُس نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اطمینان حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اطمینان کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اُس نے بلاؤز پر اپنی ساڑھی کا پلو بھی ڈال لیا۔ اور بٹوا جیسے بینک کے لاکر میں چلا گیا۔

بچے کو علم نہیں ہوا کہ بلاؤز کو بینک لاکر میں بدل دیا گیا ہے۔ کیونکہ قریب قریب یتیم بچے کو بینک لاکر کا علم نہ تھا نہ دلچسپی۔ البتہ ان دونوجوانوں کو ضرور صدمہ ہوا جو بلاؤز کے اندر کی جھانکی پر رال وغیرہ ٹپکا رہے تھے۔

بوٹ سے کچلے جانے پر بچے کے پاؤں سے جو بلبلاہٹ اٹھ کر زبان پر آگئی تھی۔ وہ پھر آنکھوں کے ایک خاموش آنسو میں بھی نمودار ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ کہ بچہ اس سے کچھ خاص متاثر نہیں ہوا کیونکہ کچلے جانے کا تو شاید وہ عادی تھا۔ عادی لوگوں میں سہن شکتی زیادہ ہوتی ہے۔

اتنے میں ایک بس اسٹاپ پر نئے آنے والے مسافروں کا ایک ریلہ آیا۔ دھکم پیل پہلے بھی دگنی تھی وہ تگنی ہو گئی اور اس نئے ریلے کی دھکا بازی میں وہ غریب اور مسکین اور بے بس، کمزور بچہ جیسے کئی فٹ تک آگے دھکیل دیا گیا۔ کئی ٹانگیں، کئی بوٹ، کئی ہاتھ اس کو زیر و زبر کرنے لگے۔

اور دو منٹ بعد میں نے دیکھا میرے ساتھی نے دیکھا، بس کے سبھی مسافروں نے دیکھا کہ بچہ بس کے آہنی فرش پر گر پڑا ہے اور سبھی آوازیں اُس کی طرف لپکی ہیں اور کہہ رہی ہیں "اٹھا لو، اٹھا لو، نجانے کس کا بچہ ہے۔؟"

دوسرے نے آواز دی "ارے، ہے کوئی اس بچے کا والی وارث!؟"

تیسرا کہنے لگا "بچے بتاؤ تو سہی تو کس کا بچہ ہے -؟"

چوتھا پکار اٹھا "نجانے کیسے سنگدل ماں باپ ہوتے ہیں؟ ایسے کمزور بچے کو اکیلے بس میں بھیج دیتے ہیں -"

اتنے میں بچہ اپنے ہی بل بوتے پر کھڑا ہو گیا اور رونے لگا میرے ساتھی نے پوچھا "تمہارا باپ کون ہے بیٹا؟"

وہ بولا -"تھیلا -"

"ارے تھیلا نہیں باپ کون ہے"

"تھیلا، تھیلا! آں ہاں، میں اپنے باپ کے لئے روٹی لے جا رہا تھا مگر وہ تھیلا نہیں مل رہا ہے، کہیں اس بھیڑ میں گم ہو گیا ہے یا بس میں رہ گیا ہے۔ کہاں ہے تھیلا؟ میرا باپ کیا کھائے گا۔ وہ تو فیکٹری میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

صبح کا اخبار

جب رام بھروسے ہاکر میرے گھر میں صبح کا اخبار پھینکنے کے لیے آتا ہے تو ساؤتھ لین کے سرے سے مسٹر سبھرامنیم بھی اپنے پالتو کتے "ٹیلو" کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ دونوں نہایت تھکی ہوئی رفتار سے چلتے ہیں۔ دھیرے دھیرے خاموش، دنیا سے بے تعلق ـــ ان دونوں کی چال دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ زندگی کی ریس ہار چکے ہوں۔ اور اب بغیر دم کے پیچھے چلے جا رہے ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ دو تھکی ہوئی اداس روحوں نے کس طرح ایک دوسرے کو تلاش کر لیا ہے۔ کیسے بھٹکتے بھٹکتے، نجانے کہاں سے آکر، وہ ساؤتھ لین میں اکٹھے ہو گئے۔ اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کہا: "آؤ، ہم باقی ماندہ زندگی ایک ساتھ گزاریں۔ کیونکہ ہم دونوں ہم آہنگ ہیں، ہم رفتار ہیں، ہم ساز ہیں۔"

بزعم خود وہ دونوں صبح کی سیر پہ نکلتے ہیں تاکہ صبح کی آکسیجن سے اپنی ہیلتھ

بنا سکیں۔ لیکن میں ڈیڑھ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اُن کی صحت میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ وہ بدستور ڈھیلے ڈھالے ہیں، کمزور ہیں، اداس اور خاموش ہیں اور بغیر وجہ کے جیئے جا رہے ہیں۔ اور بغیر وجہ کے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کی دوستی کی بنیاد صرف ایک چیز پر اٹھائی گئی ——— مسلسل بے بسی اور تھکان۔

مگر صبح سادھو تھا لین سے نمودار ہو جانا اُن کا روٹین ہے۔ جیسے رام بھروسے ہاکر کے لیے صبح کا اخبار پھینک جانا روٹین ہے۔ اور میں روٹین سے تنگ آ چکا ہوں۔ مسٹر سبھرامنیم اور ان کے کتے کی اداس اور خاموش رفتار میں کوئی چارم نہیں۔ رام بھروسے کے اخبار پھینکنے کا سٹائل بھی ہر روز ایسا ہوتا ہے اُس میں بھی کوئی چارم نہیں میں خود بھی تو اسی روٹین کا ہی غلام ہوں۔ سبھرامنیم اور کتے کے نمودار ہونے کا انتظار ضرور کرتا ہوں۔ اُن پر ایک نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ جب جا کر صبح کا اخبار اٹھاتا ہوں۔ اگر کسی دن سبھرامنیم اور کتا دھیرے دھیرے چلنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگیں، تو میں سمجھوں کہ زندگی میں کچھ نئی چیز پیدا ہوئی۔ اگر صبح کا اخبار رام بھروسے یوں پھینکے جیسے کسی کو تحفہ دیا جا رہا ہو۔ تو میں ذرا چونک اٹھوں۔ چونک اٹھنے میں ایک نیا پن تو ہوتا ہے۔

مگر نہ! روٹین توڑنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ نہ سبھرامنیم میں نہ رام بھروسے میں۔ اور نہ خود مجھ میں ——— کہ میں اخبار اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اخبار کی ہیڈ لائن بھی یہی ہوتی ہے۔

پارلیمنٹ میں لائسنس سکینڈل پر پھر ہنگامہ۔

مرکزی منسٹر نے لائسنس سکینڈل پر ایک گھنٹے تک اپنا بیان جاری رکھا۔

اور کہا کہ میں اور میرے ساتھی وزیروں نے ہاؤس کا وقار بالکل نہیں توڑا ۔ اس پر اپوزیشن نے میزیں تھپتھپائیں ۔ میزوں کے تھپتھپانے کے دوران بھی وزیر نے اپنا بیان جاری رکھا ۔ جب بیان ختم ہوا تو اپوزیشن واک آؤٹ کر گئی ۔ میرے لیے اس خبر میں بھی کوئی چارم نہیں تھا ۔ وزیر بیان دیتے رہتے ہیں ۔ سکینڈل ہوتے رہتے ہیں ۔ کبھی دہلی بند اور کبھی پٹنہ بند ہوتے رہتے ہیں ۔ اور اپوزیشن واک آؤٹ کرتی رہتی ہے ۔ یہ سب روٹین کی باتیں ہیں ۔ بالکل اسی طرح جیسے شری سبھرامنیم اپنی تھکی ہوئی رونق کو گھسیٹتا ہوا ہر صبح باہر نکل آتا ہے جیسے رام بھروسے صبح کا اخبار پھینک جاتا ہے ۔ اگر صبح کے اخبار میں ہیڈ لائن کے ساتھ یہ خبر چھپ جائے کہ آج شری سبھرامنیم کے کتے نے شری سبھرامنیم پر بھونکنا شروع کر دیا تو اخبار پڑھنے میں ایک لطف بھی آتا ہے ۔ لیکن ایسی خبر کبھی نہیں چھپتی ۔ بلکہ ہر روز ایسی ہی خبریں چھپتی ہیں :-

۱- آج موری گیٹ کے باہر ایک تانگہ اور موٹر میں ٹکر ہو گئی ۔ گھوڑا اور موٹر ڈرائیور زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ گئے ۔ پولیس مصروفِ تحقیقات ہے ۔ (بلکہ سرگرمی سے مصروفِ تحقیقات ہے)

۲- کل سول سپلائی سٹاف نے دنے نگر کے راشن ڈپو پر چھاپہ مارا ۔ ایک کوئنٹل چاول اور پندرہ کلو چینی سٹاک میں کم پائی گئی ۔

۳- ایک ڈاکٹر نے ایک نوجوان مریضہ کا دانت نکالتے وقت اس سے چھیڑ چھاڑ کی ۔ ڈاکٹر کسی پولیٹکل لیڈر کا رشتہ دار بیان کیا جاتا ہے ۔ مریضہ کے پروٹسٹ کے باوجود پولیس کیس رجسٹر کرنے میں آنا کانی کر رہی ہے ۔

۴۔ آج شری رام کالج کے سٹوڈنٹس نے ایک بس کو اغوا کر لیا۔ اور اس کے بعد اسے آگ لگا دی۔ یہ سٹوڈنٹس جن سنگھی بیان کیے جاتے ہیں۔

اور یہ خبریں پڑھتے پڑھتے جمائیاں لینے لگتا ہوں۔ کتنی بے رس خبریں ہیں۔ وزیر بیان دیتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے بیان دینے کی اُسے عادت پڑ گئی ہے۔ وزیر خود کچھ نہیں سوچتا۔ بلکہ گھڑے گھڑائے فارمولوں کو سامنے رکھ کر بیان دے دیتا ہے۔ "میرے محکمے کے کسی افسر نے بے ضابطگی کی ہو مگر اُس کی اطلاع مجھ تک پہنچی ثبوت مل جائے تو میں اُس کے خلاف کاروائی ضرور کروں گا۔"

اور یہ بیان دینے کے بعد کار پر سوار ہو کر فریغ مُسلّم سے بھرپور ڈنر کھانے چلا جاتا ہے۔ جیسے کوئی کلرک رجسٹر حاضری میں اپنی حاضری لگا کر خزانچی سے اپنی تنخواہ لینے کا حق دار بن جاتا ہے۔ اور چپڑاسی سے دو دو روپے اُدھار لے کر دیما مالنی کی فلم دیکھنے چلا جاتا ہے۔ نہ وزیر کو یہ احساس رہتا ہے کہ اناج کے متعلق وہ جو پالیسی بیان دے کر آیا ہوں اُس سے رام بھروسے ہاکر کو تین سو روپے کوئنٹل کے حساب سے گیہوں ملنے لگی ہے۔ وزیر کی روٹین توڑ کر فریغ کھانا ہے۔ رام بھروسے کی روٹین بلیک ریٹ پر گیہوں خریدنا ہے۔ دونوں کا آپس میں کوئی تال میل نہیں۔ پارٹی کی عزت بچانی ہے تو پارٹی کے ایم۔ پی کو لائسنس سکینڈل سے بچاؤ۔ یہ مت سوچو کہ جب لیڈر خود کرپشن کرتا ہے تو دستی نگر کا راشن ڈپو والا بھی کرپشن کرتا ہے۔ بلیک میں چاول بیچتا ہے۔ اور اگر سول سپلائی افسر کے گھر میں اعلیٰ ترین چاولوں کا تحفہ نہ پہنچے تو وہ راشن ڈپو ہولڈر پر چھاپہ مار دیتا ہے۔

"کیونکہ وہ چوروں سے کہتا ہے کہ یہ مال تو چوری کا ہے۔ یعنی آپ جس گھر سے چرا کر لائے ہیں۔ وہ خود ایک اسمگلر چور ہے۔ اور یہ تمام مال وہ اسمگلنگ کر کے گھر لے آیا تھا۔ اور اب وہی مال آپ وہاں سے چرا کر لائے ہیں۔ اور اگر چور ہی چور کا مال چرا کر لائے۔ تو میرا دھرم ہے کہ اُسے آدھے دام دیئے جائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "دھرم سے کیا مطلب ہوتا ہے اُس کا؟"

"وہ دلال یہ کہنے کے بعد لکشمی دیوی کی تصویر کے سامنے سربسجدہ ہو جاتا ہے۔ سربسجدہ ہونے کو ہی دھرم سمجھا جاتا ہے۔"

"اچھا تو پھر دھرم کے بعد"

"دھرم کے بعد چور بھی آدھا دام قبول کر لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی دھرم کے عقیدتمند ہوتے ہیں اور پھر نقد مال لے کر کار چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں؟"

"کار کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟"

"کیونکہ وہ بھی چوری کی ہوتی ہے۔"

غرض چوری، ہندوستانی باشندوں میں چلت پھرت کرتی رہتی ہے۔ ایک باشندے کے نفس سے دوسرے کی نفس میں، دوسرے سے تیسرے کی نفس میں، رگ و ریشے میں لہو کی دھاریں بن کر اس تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے ہاں تغیر و تبدل کرتی رہتی ہیں کہ کوئی واضح طور پر پتہ ہی نہیں لگا سکتا کہ ان میں سے چور کون ہے، سادھو کون۔ یا کب کوئی چور بن جاتا ہے اور کب کوئی سادھو۔

دراصل ہندوستان کی تہذیبی روایات میں ایک لازوال خوبی یہ ہے کہ ہندوستانی چوری کو گناہ سمجھتے ہیں۔ جب تک کسی ہندوستانی کو گناہ کا احساس نہ ہو۔ وہ چوری

وزیر بیان دے کر مرغ کھاتا ہے اور قیلولہ کرنے لگتا ہے۔ اور ڈاکٹر اپنی مریضہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتا ہے۔ اس بھروسہ پر کہ تھانیدار کو اس تھانے میں میرے بہنوئی عرف پولیٹکل لیڈر نے تعینات کرایا تھا۔ لہٰذا نوجوان مریضہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ تانگا اور موٹر تو آپس میں ٹکراتے ہی رہتے ہیں۔ بھلا اس میں کیا چارم ہے۔ تھوڑا سا چارم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ موٹر چھوٹی کی تھی۔ اور اُسے چلانے والا ممبر پارلیمنٹ کا بیٹا تھا۔

اور میں اخبار پڑھ کر حقارت سے پرے پھینک دیتا ہوں۔ نہ جانے ان باسی خبروں کو ہر روز نیا سمجھ کر کیوں پڑھتا ہوں۔ زندگی میں کوئی بھی تو نئی چیز پیدا نہیں ہو رہی۔ وزیر اور لیڈر اپنی عیاریوں اور چالبازیوں کی روٹین میں مصروف ہیں تو پھر میں اخبار کیوں پڑھتا ہوں۔ اخبار کی حیثیت سبھر اسٹیم اور اس کے کیتھ سے زیادہ تو نہیں ہے جو اس اور بے بس ہو کر ہر صبح روٹین کے غلام ہو کر ساڑھے تین بجے کے سر سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور میں رام بھروسے ہاکر سے کہتا ہوں کہ رام بھروسے! کل صبح سے اخبار پھینکنا بند کر دو۔ میں نہیں پڑھنا چاہتا۔"

اور دوسری صبح میں پھر دروازے پر آ جاتا ہوں اور رام بھروسے ہاکر کو آواز دے کر کہتا ہوں "بھئی! دکھانا ذرا آج کا اخبار! راشٹرپتی جی نے کون سا نیا آرڈیننس جاری کیا ہے؟"

کچھ آنکھوں کے بارے میں

جو لوگ دوسروں کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں، انھیں علم ہوتا ہے کہ خدا نے پیٹھ پر آنکھ نہیں بنائی۔ ایک سیاسی لیڈر نے اپنی پارٹی کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ اور دوسری پارٹی میں شامل ہو کر وزیر بن گیا۔

میں نے کہا "جناب! آپ نے پارٹی ہی نہیں، اُن ووٹروں کی پیٹھ میں بھی چھرا گھونپا ہے جنھوں نے آپ کو منتخب کر کے بھیجا تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ووٹروں کی پیٹھ پر بھی آنکھ نہیں ہے؟"

"اجی، پیٹھ پر! اُن کے تو چہرے پر بھی آنکھیں نہیں ہیں۔"

"بجا فرمایا! اگر آنکھیں ہوتیں تو کیا وہ آپ کو ووٹ دیتے۔ بہرکیف یہ آپ پر اللہ کا فضل ہی ہے کہ ووٹروں کی آنکھیں نہیں ہیں۔"

"جی ہی ہی! آنکھوں کا نہ ہونا بھی اللہ کا فضل ہی سمجھیے۔"

ہاں قارئینِ کرام! دراصل سارا فساد اللہ کا ہی ہے جس نے ہر انسان کو دو آنکھیں عطا کر دیں۔ حالانکہ ایک آنکھ سے بھی خاصا کام چل سکتا تھا۔ بلکہ زیادہ حسنِ کارکردگی سے چل سکتا تھا۔ مثلاً آنکھوں میں شرم ہوتی ہے اگر ایک آنکھ ہو تو پچاس فیصد شرم سے تو ویسے ہی نجات مل جاتی ہے۔ اور باقی رہی پچاس فیصد شرم — تو آپ بڑے اطمینان قلب سے مخاطب سے کہہ سکتے ہیں۔

"واہ صاحب واہ! آپ آئے ہی نہیں، ورنہ میں آپ کا کام کر دیتا۔"

"میں آیا تھا جناب!"

"آئے تھے؟ مگر مجھے تو نظر نہیں آئے۔"

"نظر کیسے آتا؟ آپ نے مجھے دیکھا ہی نہیں —"

"دیکھا نہیں؟ اوہو! اب سمجھا۔ آپ میری بائیں آنکھ کی طرف کھڑے رہے ہوں گے۔ آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس فقط دائیں آنکھ ہے، بائیں آنکھ ہے ہی نہیں۔"

دنیا میں جو لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اللہ کے بہت احسان مند ہیں کہ انہیں دنیا میں عدل و صداقت پھیلانے کے لیے بھیجا گیا۔ چنانچہ وہ ایک خربوزہ چرانے والے کو بھی مجرم سمجھتے ہیں اور لاکھوں کا مملنگ کا مال بیچنے والوں کو بھی مجرم سمجھتے ہیں — یہ الگ کہانی ہے کہ خربوزے کے چور کو جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور سمگلر کو ناکافی شہادت کی بنا پر بری کر دیا جاتا ہے۔

مگر قانون سب کے لئے برابر ہے، سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔

اور دیکھ لیجئے، ایک آنکھ کی بدولت قانون کس خوبی سے چل رہا ہے۔ عدالتوں

کے چپڑاسی سے لے کر ریڈر سے ہوتے ہوئے منصف تک روزانہ نقرئی سکوں سے جیبیں بھر کر گھر لے جاتے ہیں۔ اور فریقین سے کہہ جاتے ہیں "کل پھر تشریف لائیے کیونکہ قانون کا منشا ابھی پورا نہیں ہوا۔"

اور منشا سالہا سال تک اس لیئے پورا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قانون سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ دوسری آنکھ خدا نے اُسے دی ہی نہیں۔ اگر دی ہوتی تو عدالتوں میں ہزاروں مقدمے سالہا سال تک انتظار نہ کرتے۔ فیصلے فٹا فٹ ہو جاتے اور عدالتوں کی زندگی ڈل ہو کر رہ جاتی۔

ڈل نس سے اگر بچا کر رکھا ہوا ہے۔ تو اسی آنکھ نے۔

لطیفہ پرانا ہے۔ مگر نئی بوتل میں پرانی شراب کا لطف اٹھائیے۔

ایک دوست نے دوسرے دوست سے پوچھا: "تم نے میری آنکھیں دیکھیں؟"

"دیکھیں!"

"کیسی لگیں؟"

"آپ کی داہنی آنکھ مجھے جینئرین لگتی ہے۔"

"مگر میری بائیں آنکھ تو پتھر کی ہے۔"

"اسی لیئے تو جینئرین لگتی ہے۔"

میرے ایک دوست ہیں۔ اپنے آپ کو احمق کہتے ہیں۔ مگر ہر کام انتہائی دانشمندی سے کرتے ہیں۔ کچھ احباب کا خیال ہے کہ وہ دھوکہ دیتے بھی ہیں اور دھوکہ کھاتے بھی ہیں۔ مگر میں اُنہیں اس لیئے چھوٹ دے دیتا ہوں کہ وہ خالص فطری انسان ہیں کیونکہ دھوکا

کھانا اور دھوکا دینا انسان ہی کی فطرت میں ہے گدھے کی فطرت میں نہیں ــــ کیا آپ نے کسی گدھے کو ڈبل رول کرتے دیکھا ہے ؟

ایک دن واقعی کہنے لگے " یار! میں واقعی گدھا ہوں "

میں نے کہا " چلیئے ۔ آپ اصرار کرتے ہیں ۔ میں مان لیتا ہوں کہ آپ واقعی گدھے ہیں ۔ مگر گدھا ہونے کا کوئی معقول سبب تو آپ کے پاس ہوگا ۔" انتہائی حساس مگر دکھی لہجے میں بولے " ہاں ۔ سبب مجھے معلوم ہے کہ میں ہر ایک کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہوں ۔ لہٰذا دھوکہ کھا جاتا ہوں ۔"

اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ایک آنکھ کا پتھر نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھ دیا ۔ اور کہا ۔ " دیکھیئے ! میری ایک آنکھ پتھر کی ہے ۔"

مجھے تعجب ہوا ۔ سالہا سال کی دوستی کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کی ایک آنکھ پتھر کی ہے ــــ میرا تعجب اور پھر میری حس مزاح ۔ میرے منہ سے نکلا ــــ " آپ دھوکہ کون سی آنکھ سے دیتے رہے ہیں ۔ اور کھاتے کس آنکھ سے رہے ہیں ۔"

پتھر والی آنکھ کی طرف اشارہ کر کے بولے " دھوکہ اس آنکھ سے کھاتا رہا ہوں "

" تو پھر جینوین آنکھ تو یہی ٹھہری ۔ دوسری آنکھ تو صرف دانشمند ہے ۔"

ممکن ہے دو آنکھیں بنانے میں خدا کی کوئی حکمت پوشیدہ ہو ۔ مگر مجھے اس میں کوئی گہری حکمت نظر نہیں آئی ۔ سوائے اس کے کہ ایک آنکھ محبوب کو ماری جائے اور دوسری

آنکھ سے دیکھا جائے کہ محبوب پر کیا تاثر ہوا ہے۔ جوابا اُس نے بھی آنکھ ماری ہے یا بھاگ گئی ہے۔ یا اپنا سینڈل اُٹھا کر مارنے کے لیے بڑھ رہی ہے تاکہ اس کی بجائے آپ بھاگ سکیں۔

ورنہ دو آنکھوں کے ہمیشہ الٹے ہی اثرات ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک ایڈیٹر صاحب اپنے ماہنامے کی پیشانی پر ہمیشہ لکھا کرتے تھے۔

"ہندو ہے ایک آنکھ۔ مسلمان دوسری"

لیکن ۱۹۴۷ء میں میری اس چشم گناہگار نے دیکھا کہ دونوں آنکھیں ایک دوسرے سے وحشیانہ طور پر لڑ پڑیں۔ اور ایک آنکھ نے اپنا نام پاکستان رکھ لیا۔ اور دوسری آنکھ۔ ؟ اگرچہ سیکولر رہی۔ لیکن آج بھی متعدد مسجدیں آہن و آتش کی ریہرسلیں ہوتی رہتی ہیں۔ تاکہ ایک آنکھ کا پتھر دوسری آنکھ کے پتھر کو توڑ کر رکھ دے۔

اے خدا! کیا تو دوسری آنکھ بنانے کی پالیسی پر نظر ثانی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سُنا ہے تو اپنی ساری مخلوق کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اپنے لیے ایک آنکھ تو ہمارے لیے دو کیوں ؟۔

معذوروں کا سال

اتحادی سبھا، دنیا بھر میں معذوروں کا سال منا رہی ہے۔ یہ سال وہ سنستھا منا رہی ہے جو خود انتہائی معذور ہے۔ کافی ہاؤس کے ایک ملنگ نے ریمارک کیا۔ "دراصل نہ وہ دوسروں کا نام لے لے کر اپنا ہی سال منا رہی ہے۔ پنجابی میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ عورت دوسروں کے گھر سیاپے میں جاتی ہے مگر وہاں اپنے بھائیوں کا نام لے لے کر روتی ہے۔"

گزشتہ کئی برسوں سے متواتر عالمی سال منائے جا رہے ہیں۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جب وہ ایک رستے پر چل رہی ہوتی ہے تو پھر متواتر کئی سال اسی راستے پر چلی جاتی ہے۔ مثلاً اسی پر جنگ کا موڈ آ جائے تو پھر کئی کئی سال جنگ ہی کئے جاتی ہے۔ اور جب جنگ سے بہت سے انسان، عمارتیں اور کھیت پھنک جاتے ہیں تو پھر شکھ کا سانس لیتی ہے۔ اور جب اس پر امن کا موڈ سوار ہو جاتا ہے تو

تو ہر انسان کی زبان پر ایک ہی لفظ ہوتا ہے "امن! امن!! یہاں تک کہ اگر کوئی چور بھی کسی کے گھر میں گھس جائے تو گھر کا مالک کہتا ہے "چور جی! بڑے امن اور اطمینان سے چیزیں اٹھانا۔ نہ میں شور مچاؤں گا نہ تم دنگا فساد کرنا۔ سمجھے! آج کل امن کا موڈ چل رہا ہے۔"

چنانچہ آج کل بھی متواتر عالمی سال منانے کا موڈ چل رہا ہے ــــ پہلے بچوں کا سال منایا گیا تو اس میں پہلے سے زیادہ بچے اغوا کیے گئے۔ بلکہ ہزاروں روپے لے کر ماں باپ کو لوٹا بھی دیئے گئے۔ ایک اغوا کنندہ نے تو مجھے یہاں تک کہا کہ "میں نے تو بچہ اس لیے لوٹا دیا کہ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، بلکہ بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے ــ ہزاروں روپے کی ــ"

اُس کے بعد عورتوں کا سال منایا گیا تو عورتوں نے اس میں ورائٹی پیدا کی۔ یعنی وہ خود اغوا نہیں ہوئیں۔ بلکہ انہوں نے مردوں کو اغوا کرنا شروع کر دیا۔ اغوا کے بعد اُن سے شادی کی۔ اور شادی کے بعد ان سے طلاق بھی لی۔ بلکہ ایک مرد کے متعلق تو میرے پاس مصدقہ اطلاع ہے (مصدقہ کا مطلب ہے پولیس تھانے کی اطلاع نہیں ہے)۔ کہ وہ مغویہ مرد طلاق کے کاغذ پر دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھا تو اغوا کرنے والی عورت نے اُس مرد پر مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دیا ــ پہلے عورتوں کو مٹی کے تیل سے جلایا جاتا تھا عورتوں کے سال میں مردوں کو جلا دیا گیا۔

بچوں اور عورتوں کے سال کی کامیابی کے بعد میں نے اتحادی سبھا کو تجویز بھیجی کہ اب بوڑھوں کا سال بھی منایا جائے۔ لیکن بوڑھے اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ جیسے بچوں اور عورتوں کے سال میں اغوا کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں بوڑھوں

کا سال منانے سے کہیں جنازوں کی تعداد نہ بڑھ جائے۔

اُن کی دلیل تھی اور معقول دلیل تھی کہ جنازہ ہمیں بھی بڑی نیچرل چیز لگتا ہے۔ بشرطیکہ دوسروں کا ہو۔

اور اب معذوروں کا سال ..... ؟ ؟ نیچرل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سال میں معذوروں کی تعداد بڑھ جاتی۔ مگر ماشاء اللہ اُن کی تعداد پہلے ہی اتنی زیادہ ہے کہ سوائے جنگ کی بیماری کے انہیں کم نہیں کیا جا سکتا۔

اور خدا کا شکر ہے کہ دنیا میں امریکہ موجود ہے جو معذوروں کا سال بھی مناتا ہے۔ اور جنگ کے لیے اسلحہ ساز فیکٹری بھی چلاتا ہے۔

بمبئی سے میرا ایک دوست آیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "دہلی میں تشریف آوری کیسے ہوئی۔"

اُس نے کہا۔ "معذوروں کے سال کے لیے چندہ مانگنے آیا ہوں۔ رسید بک بھی چھپوا کر ساتھ لایا ہوں۔"

میں نے پوچھا "بمبئی میں معذور کون ہے ؟"

وہ بولا۔ "میں خود۔ سب سے بڑا معذور ہوں۔"

وہ ایک حسین رقاصہ کو بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ جس نے اُس کی دو تین فلموں میں کام کیا تھا۔ میرے دوست کا بیان تھا کہ ہم دونوں شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ دن کے وقت سٹوڈیو میں رات کو اپنے مکان کے ڈارک روم میں۔

"مگر اب یہ بھی معذور ہو گئی ہے۔" دوست نے بتایا۔

"کیسے؟ رقص تو اب اس کے چہرے پر حسن بن کر لہرا رہا ہے۔"

"ہماری فلمیں بری طرح فلاپ ہو گئیں۔ بھاری قرض تلے اس کا حسن اور میرا آرٹ دونوں دب گئے۔ اب اسے دہلی میں ہمراہ لایا ہوں۔ معذوروں کے سال کے لیے جس کے سامنے بھی یہ قاتل کٹورا چندے کی رسید بک رکھ دیتی ہے وہ ریشہ خطمی ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو، معذوروں کا سال بھی صرف قیامت خیز حسینائیں ہی منا سکتی ہیں۔"

"اور دو شقوں میں" میں نے بظاہر چوٹ کی۔

چوٹ ضائع ہو گئی۔ بولا "ارے بھائی! قرضے کے بوجھ سے سر اٹھانا ہے تو ہر طرح کی شقیں لگانا پڑتی ہیں۔ اور شکر ہے اہل ذوق بڑی فراخ دلی سے چندہ دے رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیوں نہ دیں اہل ذوق بھی تو حسن کے سامنے معذور ہو جاتے ہیں۔ بالکل اپاہج!"

لفظ اپاہج پر میرا دوست کھلکھلایا۔ کہنے لگا۔ "میں نے بمبئی میں ایک ارب پتی اپاہج دیکھا۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "ارب پتی؟ اور اپاہج؟ ارے وہ تو اپنی دولت سے دوسروں کو اپاہج بنا کر رکھ دے۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "میں کمیونسٹ ہوتا تو یہ بات مجھے غلط لگتی۔ لیکن اب وہ ارب پتی ایک عربی شیخ ہے۔ تیل پیتا تھا، تیل پلاتا تھا، تیل نکلتا تھا تو اگلتا بھی تیل ہی تھا۔ سبھی مرد و زن اس کے اردگرد طوائفوں کی طرح طواف کرنے لگے۔ اس کی آمد پر مارکیٹ میں ہر شے کے ریٹ بڑھ گئے۔ مشروب کے بھی، مضروب کے بھی۔ رقص

نہیں کرتا۔ اور پھر وہ گناہ کو بخشوانے کے لیے ایسے ایسے جوڑ توڑ، سوڑ کرتا ہے کہ گناہ مر جاتا ہے، چوری سربلند ہو کر زندہ رہتی ہے۔ مثلاً ایک قوالہ اللہ کا نام چوری کرنے سے پہلے لیا جاتا ہے۔ تو چوری کا ایک چوتھائی گناہ اللہ بخش دیتا ہے، جو عموماً بخشن ہار رہا جاتا ہے۔

پھر چوری کا کچھ مال وہ عبادت خانے کو دان میں دے دیتا ہے۔

کبھی کبھی کسی سیاسی پارٹی کو الیکشن میں اخراجات کی ضرورت ہو تو وہ چوروں کی طرف ہی رجوع کرتی ہے۔

میں نے مال گاڑی کے ایک ریلوے کلرک کو دیکھا۔ وہ ایک بیوپاری سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھئے بھائی صاحب! پچاس روپے کچھ پیسے تو آپ کے مال کا سرکاری کرایہ ہے۔ لیکن بلٹی اس وقت دوں گا۔ جب آپ دس روپے ہمارا مقررہ بھتہ عنایت کر دیں گے۔"

بیوپاری نے دس روپے اپنی نظر بچا کر ریلوے کلرک کی جیب میں ڈال دیئے۔

میں نے ریلوے کلرک سے کہا۔ "آپ چور ہیں دس روپے بیوپاری کی جیب سے اپنی جیب میں منتقل کر لیے۔"

بولا۔ "جناب یہ چوری نہیں ہے، سوشلزم ہے اور سرکار نے سوشلزم پھیلانے کی پالیسی کا ہمیں حکم دے رکھا ہے۔"

"سوشلزم کس طرح ہے۔"

"کیونکہ میں یہ دس روپے اسٹاف کے دس ممبروں میں بانٹ دوں گا،

کے بھی موسیقی کے بھی۔ مکھن، ملائی۔ پھل، دودھ، انار، لڑکیاں، ہر چیز کے دام تگنے، چوگنے پھر گنے ہی گے ہو گئے اور......"

میں نے اسے جھڑک کر کہا: "اور گنے کے بچے! اپنا گھٹیا لیکچر بند کرو۔ یہ بتاؤ کہ پھر کیا ہوا؟"

وہ بولا: "وہی ہوا جو منظور خدا تھا۔ ممنوعہ چیزیں اس کے اندر پے در پے، پے در پے جاتی رہیں۔ تو ایک صبح جب فائیو سٹار ہوٹل میں اس کی آنکھ کھلی تو اس سے نہ دیکھا جا سکا نہ اُٹھا جا سکا۔"

"کیوں؟ کیا پیسے ختم ہو گئے؟"

"نہیں۔ ناڑیوں نے نیچرل طریقے سے کام کرنا بند کر دیا۔ اُسے فالج ہو گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ تمام طوائفیں، طوات سے گھبرا کر بھاگ گئیں۔ اور آج کل وہ تن تنہا ایک ہسپتال کے بستر پر اپاہج بن کر پڑا ہوا ہے۔"

میں نہ ہکا بکا ہوا نہ بکا ہوا۔ صرف منہ سے اتنا نکل گیا: "پیارے تیل کی سیاست بھی اسی طرح ایک دن اپاہج ہو جائے گی۔ اور تمہاری طرح چندے کی رسید بک چھپوا کر ملکوں ملکوں گھوما کرے گی۔"

مگر میرے دوست نے ایک تبسم بر لب آہ بھری۔ "مگر میرے ہمراہ تو ایک حسین رقاصہ بھی ہے۔ تیل کے اپاہج سوداگروں کے پاس تو وہ بھی نہیں ہو گی۔"

میں نے سوچا معذوروں کا سال غلط سنہ میں منایا جا رہا ہے۔ معذوروں کے لیے تو وہ سال زیادہ موزوں رہے گا جب نہ علی بابا چالیس چور والے تیل کے گپتے ہوں گے اور نہ ناچنے والی حسین مرجینا!

مہنگائی الاؤنس کا تھپڑ

خاوند نے اخبار ایک طرف پھینکا اور بے اختیار بیوی کا بوسہ لے لیا۔ گذشتہ آٹھ برس سے وہ بوسے سے الگ تھلگ زندگی گزار رہی تھی۔ بوسے میں کونسی لذت پنہاں ہوتی ہے۔ وہ اس سے قریب قریب نا آشنا ہو چکی تھی۔

مگر یہ اچانک بوسہ، اُسے حیرت ہوئی۔ کچھ نسوانی حیا بھی اُس میں جی اٹھی۔ جو آٹھ برس سے قریب قریب دفن ہو چکی تھی، خاوند سے بولی۔ "چھوڑیئے بھی! یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ اگر کسی نے دیکھ لیا تو.....؟"

خاوند نے کہا۔ "پگلی! شرم کیسی؟ اخبار میں لکھا ہے۔ سرکار نے ہمیں مہنگائی کی ایک قسط دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ جب سرکار کو شرم نہیں آئی تو ہمیں کیسی شرم —؟ چلو، آج قسط کی خوشی میں مجھے انڈا کھلاؤ۔"

"ہر روز تو آپ انڈا کھاتے ہیں۔ پھر یہ آج انڈے کی طلب؟"

"خاک کھلاتی ہو۔ دو انڈے کی بھُرجی میں گھر کے آٹھ بندرے بھگتا دیتی ہو مگر آج یہ ختت نہیں چلے گی۔ مہنگائی کی قسط ملی ہے۔ گھر کے ہر آدمی کو ایک ایک انڈا ملیگا۔ سمجھ گئیں۔ منگا ڈ انڈے!"

بوسہ اور انڈا ـــ گھر کے بچّوں کو دونوں کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہیں بوسے کے مقابلے پر انڈے کی کوالٹی زیادہ بہتر لگی۔ اور جب اتی نے بڑے لڑکے راجکمار کو حکم دیا کہ جاؤ، حکم چند انڈا فروش سے آٹھ انڈے لے آؤ۔ تو اس نے سکول کے ہوم ورک پر فوراً لعنت بھیجی اور پیسے لے کر مارکیٹ کی طرف بھاگا۔

راستے میں شامو، ہماری خردور کا لڑکا (ظاہر ہے ننگے پاؤں) آرہا تھا۔ راجکمار نے جاتے جاتے شامو کے رخسار پر تھپڑ جمادیا۔ شامو بولا "کیوں صاحب! یہ تھپڑ کس سلسلہ میں، میرا قصور؟"

راجکمار بولا "بدلہ جا رہا ہیں۔ ہمارے باپو کو ایک اور مہنگائی قسط مل گئی ہے۔ ہم کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اور دنیا کے جتنے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ وہ ان لوگوں کو ضرور تھپڑ لگاتے ہیں جن کے پاؤں میں جوتی نہیں ہوتی۔"

شامو کو غصہ تو بہت آیا مگر ایک تو وہ ننگے پاؤں تھا۔ جوتا پہنے ہوتا تو غصے میں راجکمار کے سر پر جوتا ہی جما دیتا۔

اور پھر انڈے کا نام اس نے صرف کتاب میں پڑھ رکھا تھا۔ کھایا کبھی نہیں تھا۔ جس کے پاس جوتا نہ ہو، اور انڈے کا مطالعہ صرف کتاب تک محدود ہو اُسے غصہ تو آتا ہے مگر غصہ کو پی جانے کی عادت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ کر بدلہ لینا چاہا "میرے باپو کو بھی مہنگائی الاؤنس کی قسط مل جائے گی۔ پھر دیکھونگا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کون مجھے تھپڑ لگاتا ہے۔"

اور راجکمار کا جواب تھا "ابے جا بے جا۔ تمہارے باپو کو مہنگائی الاؤنس کی قسط کیسے مل سکتی ہے۔ وہ عمارتی مزدور ہے، کوئی سرکاری ملازم تھوڑے ہے۔"

شامو کے ذہن میں یہ فلاسفی نہیں آسکی۔ کہ مہنگائی الاؤنس کا تعلق سرکاری ملازم سے کیوں ہوتا ہے، عمارتی مزدور سے کیوں نہیں۔ میں باپو سے جاکر کہوں گا۔ وہ سرکاری ملازمت اختیار کرلے۔ عمارتی ٹھیکیداروں کی مزدوری چھوڑ دے۔ ورنہ مجھے اسی طرح تھپڑ پڑتے رہیں گے۔

بہرکیف تھپڑ کھا کر وہ ایک طرف بے بسی کی صورت لیے چلا گیا۔ اور راجکمار ایک تازہ فلمی گیت کے بول گنگناتا ہوا مارکیٹ کی طرف حکم چند انڈا فروش کی دکان پر پہنچ گیا۔

جاتے جاتے اسے ماں نے تنبیہہ کردی تھی کہ اگر ایک انڈا بھی تمہارے ہاتھوں راستے میں ٹوٹ گیا تو اس کی مزاصرف تمہیں ملے گی۔ یعنی سب کو انڈے ملیں گے تمہیں نہیں ملے گا۔

ذاتی غرض کے لیے انسان کو احتیاط اور ڈسپلن سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈسپلن کبھی سوشل مسئلہ نہیں رہا۔ ذاتی مسئلہ ہی رہتا ہے۔

راجکمار نے گردن تن تنا کر حکم چند انڈا فروش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آٹھ انڈے دے دو۔"

حکم چند ہکا اور بکا دونوں ہو کر رہ گیا۔ کہ اس چیونٹی خاندان کو کیسے پر نکل آئے۔

مگر آدمی گھاگ تھا۔ اُس کے باپ نے انڈوں اور مرغیوں کے کاروبار سے ہی دو مکان خرید لیئے تھے۔ اس لیے بولا۔ "بیٹا راجکمار! آٹھ انڈوں کے لیے کتنے پیسے گھر سے لائے ہو۔"

"تین روپے بیس پیسے۔ تم سمجھتے ہو، مجھے حساب نہیں آتا ہے۔ کلاس میں ریاضی کا پرچہ حل کرتا ہوں تو سب سے زیادہ نمبر لاتا ہوں۔"

لیکن حکم چند انڈا فروش نے اس کی پوری فرسٹ ڈویژن ریاضی فیل کر دی۔ بولا۔ "برخوردار! اب انڈوں کا ریٹ بدل گیا ہے۔ آٹھ انڈوں کے چار روپے لگیں گے۔ پچاس پیسے فی انڈا۔"

"کیوں؟"

"جانتا نہیں۔ سرکاری ملازموں کو مہنگائی الاؤنس کی ایک قسط مل گئی ہے۔"

"ہاں، ہاں، مگر تم کیسے معلوم ہوا؟" "اخبار پڑھ کر معلوم ہوا۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ میں اخبار نہیں پڑھتا۔ مجھے بھی تو اخبار پڑھ کر معلوم ہوا۔ لہٰذا بھاگ جاؤ اور ماں سے پورے چار روپے لے آؤ۔"

راجکمار لاکھ ریاضی میں اوّل آتا رہا۔ لیکن مہنگائی الاؤنس اور انڈے کے ریٹ کی ریاضی اُسے سکول میں نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اُسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ مہنگائی الاؤنس سرکار نے صرف اس لیئے بڑھایا ہے۔ تاکہ ہمارے گھر کے ہر بندے کو الگ الگ انڈا کھانے کے لیئے ملے میرے ڈیڈی کا بھی یہی حکم تھا کہ اب انڈا سب کو ملے گا۔ نجانے ڈیڈی نالائق ہے یا میں؟ — کہیں ایسا تو نہیں کہ پہلے اولاد نالائق نکلا کرتی تھی، آج کل والدین نالائق نکل رہے ہیں۔

وہ سر لٹکائے گھر کی طرف لوٹا۔ اگرچہ راستے میں اُسے پھر وہی شامو ملا۔ لیکن اس مرتبہ اس نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ اس میں انسانیت آگئی تھی۔

گھر لوٹا تو دیکھتا کیا ہے۔ کہ ڈیڈی پھر ممی کا بوسہ لے رہا ہے۔ راجکمار چیخا۔ "ڈیڈی! ڈیڈی! بوسہ روک لو۔"

ڈیڈی نے کہا۔ "لینے دو بیٹا! ابھی ابھی ریڈیو پر اعلان ہوا ہے۔ کہ سرکار دسمبر سے مہنگائی الاؤنس کی ایک اور قسط بھی دے رہی ہے۔"

"نہیں ڈیڈی! جسے آپ بوسہ سمجھ رہے ہیں، وہ بوسہ نہیں ہے۔ ممی کے منہ پر ایک اور تھپڑ ہے۔ ایک تھپڑ لگایا تو انڈیا چالیس کی بجائے پچاس پیسے کا ہو گیا۔ اب اس دوسرے تھپڑ کے بعد ساٹھ پیسے کا ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے تین روپے میں پیسے فرش پر پھینک دیئے اور سکول کے ہوم ورک میں مصروف ہو گیا۔

اخبار پڑھنا بند!

اُس دن میں اخبار کے ہاکر سے باقاعدہ خانہ جنگی پر اُتر آیا۔ اور اُسے علامتی نحش گالیاں تک دے ڈالیں۔ علامتی نحاشی وہ ہوتی ہے جس میں نحاشی نچلی تہوں میں ہوتی ہے اور علامت اوپری تہوں میں۔ کچھ لوگ اسے فائن آرٹ بھی کہتے ہیں۔ اسی فائن آرٹ کے متعلق غالب نے بھی کہا تھا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

چنانچہ میں نے بھی اخبار کے ہاکر سے کہا "آج سے تم میرے گھر میں اخبار مت پھینکا کرو۔ اخبار پڑھنا بند۔ اس سے بہتر ہے میں صبح اٹھ کر گندی نالی سے منہ دھو لیا کروں۔"

وہ بولا "آپ نے مجھے گندی نالی کہا۔"

"میاں تم گندی نالی بنے ہو۔ گندی نالیوں کے ٹھیک سپلائر ہو۔ سمجھ گئے۔ یا اپنی ناقص سمجھ کو تمہاری ناقص ترین سمجھ سے مزید آلودہ کریں۔"

گویا باقاعدہ خانہ جنگی۔ یہ خانہ جنگی نمبر دو تھی۔ کیونکہ میں خانہ جنگی نمبر ایک پہلے اپنے ایک نزدیکی رشتہ دار سے کر چکا تھا۔ جو اپنے بیٹے کے عقدِ ثانی کا دعوت نامہ لے کر آیا تھا۔ پہلی بہو کو وہ مٹی کا تیل چھڑک کر پھونک چکا تھا۔ اور پولیس اور ڈاکٹر کی برکت سے باعزت بری ہو چکا تھا۔ میں نے اسے پہلی بہو کا حوالہ دینا تضیعِ اوقات سمجھا۔ ایسی باعزت بریت عام طور پر وقت اور الفاظ کی بربادی سمجھی جاتی ہے۔

البتہ میں نے تفریحاً اس سے یہ ضرور پوچھ لیا "پیارے رشتہ دار! یہ تمہارے چہرے کا جاہ و جلال ۔۔۔؟ ذرا یہ خاندانی نسخہ ہمیں بھی بتا دو۔ کہ تم کس چکی کا آٹا کھاتے ہو؟"

وہ بولا "وہ نسخہ سیدھا سادا۔ روزانہ ایک جوڑا مرغا اور سکاچ وسکی۔ بس جلال ہی جلال۔"

"مگر ساڑھے آٹھ سو ماہانہ تمہارا مشاہرہ ہے۔ یہ مرغا اور سکاچ کیسے افورڈ کرتے ہو؟"

"بس اللہ کا فضل ہے۔"

"اللہ کا یا اُس مجسٹریٹ کا جس کے زیرِ سایہ تم ریڈر ہو۔ اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ۔ کیا اس مجسٹریٹ کے پیچھے دیوار پر وہ انصاف کا ترازو بھی لٹکا رہتا ہے؟"

بس اسی پوائنٹ پر اُس رشتے دار سے خانہ جنگی ہو گئی۔ چائے کی آدھی پیالی

چھوڑ کر بطور پروٹسٹ اٹھ کر چلا گیا۔ جاتے جاتے دھمکی بھی دے گیا کہ اگر بیاہ میں شامل ہونا ہو تو آجانا۔ ورنہ تمہارے بغیر بھی شادی ٹھاٹھ باٹھ سے ہو گی۔ راجستھان سے ایک وزیر تک اس میں شامل ہو رہا ہے۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ راجستھان کے وزیر ایسی باتوں کے لیے کیوں مشہور ہیں؟

اور خانہ جنگی نمبر دو میں نے اخبار کے ہاکر سے کر ڈالی مگر باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اخبار کے ہاکر کی بھی یہ دوسری خانہ جنگی تھی۔ پہلی خانہ جنگی شاید صبح صبح اپنی بیوی سے کر آیا تھا بیوی نے منگل وار کا برت رکھا تھا۔ اور برت میں انلوچ کی بجائے پھل کھانے کا تقاضا کیا تھا۔ لیچی، آلو بخارا، میسمی وغیرہ مگر خاوند کی دلیل تھی کہ جہنم میں جائے تیرا برت۔ بھلا پھلوں کی اس سو شلزم زدہ مہنگائی میں کوئی ایسے برت رکھتا ہے ــــ بیوی بولی "میں آپ کی درازیٔ عمر کے لیے برت رکھتی ہوں۔"

"میری درازیٔ عمر سے تمہاری بیوگی اچھی۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ بیوی دراصل اپنی بیوگی کو روکنے کے لیے یہ برت رکھا کرتی تھی۔ اور اس روک تھام کو وہ خاوند کی درازیٔ عمر کا نام دے رہی تھی۔

بہر کیف میں نہیں جانتا ان کی باہمی خانہ جنگی میں بیوگی کے متعلق قطعی فیصلہ کیا ہوا۔ لیکن میں نے ہاکر سے کہا کہ میں اخبار پڑھنے کی بجائے گندی نالی میں منہ دھونے کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں۔ تو میں نے دیکھا۔ ہاکر کا منہ بھی کافی آف ہو چکا ہے۔ اور اُسے جیسے لگ رہا تھا کہ میں نے اخبار نہ پڑھنے کی دھمکی نہیں دی۔ بلکہ منگل وار کا برت رکھنے کا